مسلک اعلیٰ حضرت و جمہور علماے اہل سنت کے افکار و نظریات کا ترجمان

الرضا انٹرنیشنل پٹنہ

BIMONTHLY AL-RAZA (INTERNATIONAL) PATNA

عید اضحیٰ مبارک

تقبل الله منا ومنكم صالح الأعمال

مئی، جون ۲۰۲۶ء

MAY, JUNE 2026

مسلم سلاطین ہند اور موجودہ دور حکومت: ایک تقابلی جائزہ (اداریہ)

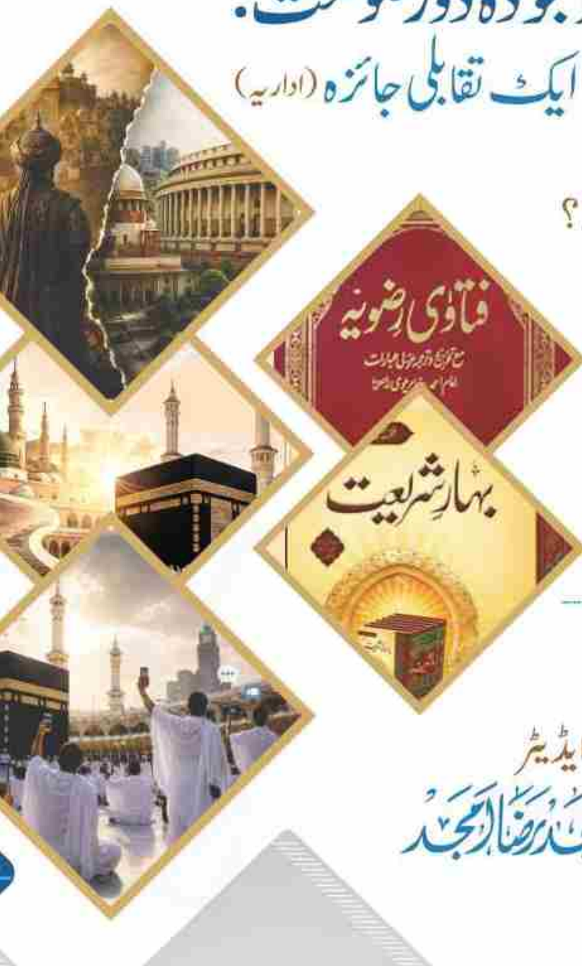

- کیا فتاویٰ رضویہ اور بہار شریعت میں تعارض ہے؟
- علامہ فضل حق خیر آبادی فلسفی یا متکلم: تحقیقی جائزہ
- عہد صحابہ تابعین میں جمع حدیث: تحقیقی مطالعہ
- حج و زیارت: یعنی روح کی تازگی کا مقدس سفر
- عبادت کی روح اور اظہار کے شور کا تصادم

اور بھی بہت کچھ ---------------

چیف ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد امجد رضا امجد

بیادگار:

امام اہلسنت سیدنا سرکار اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز

بظلِ روحانی

حجۃ الاسلام حضرت علامہ الشاہ محمد حامد رضا خاں قدس سرہ العزیز

مفتی اعظم ہند حضرت علامہ الشاہ محمد مصطفےٰ رضا نوری قدس سرہ العزیز

بفیضِ روحانی

جانشین حضور مفتی اعظم ہند تاج الشریعہ حضرت علامہ الشاہ مفتی اختر رضا خاں قادری رضوی الازہری قدس سرہ العزیز

زیر عاطفت

محدث کبیر حضرت علامہ الحاج الشاہ ضیاء المصطفیٰ قادری امجدی مدظلہ العالی جامعہ امجدیہ

مسلکِ اعلیٰ حضرت و جمہور علماء اہلسنت کے افکار و نظریات کا ترجمان

دوماہی الرضا انٹرنیشنل پٹنہ

جلد نمبر ۱۰ — شمارہ نمبر ۵۶

Bimonthly AL-RAZA (International) Patna

May to June. 2026 مئی تا جون ۲۰۲۶ء

مدیر اعلیٰ:
ڈاکٹر محمد امجد رضا امجد، پٹنہ

مدیر:
احمد رضا صابری، پٹنہ

سرپرست مجلس ادارت

شہزادہ حضور تاج الشریعہ حضرت علامہ عسجد رضا خاں قادری مدظلہ العالی

مجلس ادارت

● مفتی ذوالفقار حنان نعیمی ● مولانا بلال انور رضوی مصباحی، جہان آباد ● غلام مصطفیٰ نعیمی دہلی ● مولانا جمال انور رضوی کلیر، جہان آباد ● مولانا قمر الزماں مصباحی ● مولانا سید شاہ عبد القادر جیلانی میاں ممبئی ● مولانا مستقیم احمد رضوی ناگپور ● مولانا ابو محامد غزالی ناگپور ● ڈاکٹر شفیق اجمل قادری بنارس ● مولانا عبد الرحیم نشتر فاروقی ● مولانا قاری نوازش کریم فیضی ● مولانا حماد رضا قادری پٹنہ

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ

دوماہی الرضا انٹرنیشنل، پٹنہ

پتہ: القلم فاؤنڈیشن، گراؤنڈ فلور، جامعہ حضرت فاطمہ عالم گنج، پٹنہ (بہار) ۸۰۰۰۰۶

Cont. 9835423434 / 8521889323 / 9508881232

Bimonthly AL-RAZA (International) Patna
C/o. AL-QALAM FAOUNDATION
Jamia Hazrat Fatima, Alamganj
Patna - Pin. No. 800006
E-mail: alraza1437@gmail.com

رابطہ: (مدیر اعلیٰ) amjadrazaamjad@gmail.com/9835423434
رابطہ: (مدیر) ahmadrazasabri@gmail.com/ 8521889323

قیمت فی شمارہ: ۳۰ روپے، سالانہ ۱۸۰ روپے بیرون ممالک سالانہ ۲۵ امریکی ڈالر

گول دائرے میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زر سالانہ ختم ہو چکا ہے براے کرم اپنا زر سالانہ ارسال فرمائیں تا کہ رسالہ بروقت موصول ہوسکے۔

قانونی انتباہ! مضمون نگار کی آرا سے ادارہ "الرضا" کا اتفاق ضروری نہیں! کسی بھی مسئلہ میں ادارہ الرضا کا موقف وہی ہے جو اعلیٰ حضرت کا ہے اس کے خلاف اگر کوئی مضمون دھوکہ میں شائع ہو بھی جائے اسے کالعدم سمجھا جائے۔ کسی بھی طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف پٹنہ کورٹ میں قابل سماعت ہوگی۔

پرنٹر پبلشر احمد رضا صابری ڈائریکٹر احمد پبلیکیشنز (پرائیویٹ لمیٹیڈ) نے سبزی باغ سے طبع کر کے دفتر دوماہی الرضا انٹرنیشنل، پٹنہ سے شائع کیا۔

فہرست مشمولات

مشمولات

منظومات
* نعتیہ کلام — اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ — 3

اداریہ
* مسلم سلاطین ہند اور موجودہ دور حکومت: ایک تقابلی جائزہ — محمد امجد رضا امجدؔ — 4

تاثرات
* مولانا غلام مصطفےٰ نعیمی * مولانا ظفر الدین برکاتی * شاہ ریان ابوالعلائی
* مولانا اشرف رضا قادری * مولانا پھول محمد نعمت رضوی — 08

آپ کا سوال
* کیا فتاویٰ رضویہ اور بہار شریعت میں تعارض ہے؟ — فقیہ النفس مفتی محمد مطیع الرحمٰن رضوی — 13

افکار اسلامی
* علامہ فضل حق خیرآبادی فلسفی یا متکلم: تحقیقی جائزہ — علامہ محمد احمد مصباحی — 18
* عہد صحابہ تابعین میں جمع حدیث: تحقیقی مطالعہ — مولانا محمد فاروق اعظم شمسی — 24
* حج و زیارت: یعنی روح کی تازگی کا مقدس سفر — مولانا ظفر الدین برکاتی — 32

فکر و نظر
* عبادت کی روح اور اظہار کے شور کا تصادم — مولانا ملک الظفر سہسرامی — 37
* علم الصیغہ کے دو قاعدے کی تحقیق جدید — مولانا رضوان احمد شریفی — 44
* درگاہیں روح کی پناگاہیں یا بازار کی رونق — شاہ ریان ابوالعلائی — 49

سوشل میڈیا کا درپن
* مولانا غلام مصطفےٰ نعیمی * مولانا انیس الرحمٰن رضوی بہرائچی
* احمد رضا صابری * محمد ریحان رضا — 51

مطالعہ رضویات
* امام احمد رضا کے حاسدین کی خدمت میں — مولانا حماد رضا قادری — 56

یادرفتگاں
* مولانا فیض الرحمٰن اشرفی کی حدیثی خدمات — ڈاکٹر حبیب الرحمٰن علیگ — 59

اعلانات
* پوپری میں دارالعلوم مفسر اعظم کا قیام — مولانا صلاح الدین رضوی — 64

***

منظومات

حسان الہند امام احمد رضا قادری فاضل بریلوی

شکرِ خدا کے آج گھڑی اُس سفر کی ہے
جس پر نثار جان فلاح و ظفر کی ہے

گرمی ہے تپ ہے درد ہے کلفت سفر کی ہے
نا شکر! یہ تو دیکھ عزیمت کدھر کی ہے

کس خاکِ پاک کی تو بنی خاکِ پا شفا
تجھ کو قسم جنابِ مسیحا کے سر کی ہے

آبِ حیاتِ روح ہے زرقا کی بوند بوند
اکسیرِ اعظمِ مسِ دل خاکِ در کی ہے

ہم کو تو اپنے سائے میں آرام ہی سے لائے
حیلے بہانے والوں کو یہ راہ ڈر کی ہے

لٹتے ہیں مارے جاتے ہیں یوں ہی سُنا کیے
ہر بار دی وہ امن کہ غیرت حضر کی ہے

وہ دیکھو جگمگاتی ہے شب اور قمر ابھی
پہروں نہیں کہ بست و چہارم صفر کی ہے

ماہِ مدینہ اپنی تجلّی عطا کرے!
یہ ڈھلتی چاندنی تو پہر دو پہر کی ہے

مَنۡ زَارَ تُرۡبَتِیۡ وَجَبَتۡ لَهٗ شَفَاعَتِیۡ
اُن پر دُرود جن سے نوید اِن بُشَر کی ہے

اس کے طفیل حج بھی خدا نے کرا دیے
اصلِ مُراد حاضری اس پاک در کی ہے

کعبے کا نام تک نہ لیا طیبہ ہی کہا
پوچھا تھا ہم سے جس نے کہ نہضت کدھر کی ہے

کعبہ بھی ہے انھیں کی تجلّی کا ایک ظل
روشن انھیں کے عکس سے پتلی حجر کی ہے

ہوتے کہاں خلیل و بنا کعبہ و منیٰ
لَوۡلَاکَ والے صاحبی سب تیرے گھر کی ہے

مولیٰ علی نے واری تِری نیند پر نماز
اور وہ بھی عصر سب سے جو اعلیٰ خطر کی ہے

صدّیق بلکہ غار میں جان اس پہ دے چکے
اور حفظِ جاں تو جان فروضِ غُرَر کی ہے

ہاں تو نے اِن کو جان، اُنھیں پھیر دی نماز
پر وہ تو کر چکے تھے جو کرنی بشر کی ہے

ثابت ہوا کہ جملہ فرائض فروع ہیں
اصل الاصول بندگی اس تاجوَر کی ہے

شر خیر شور سور شرر دور نار نور!
بشریٰ کہ بارگاہ یہ خیر البشر کی ہے

مجرم بلائے آئے ہیں جاءوک ہے گواہ
پھر رد ہو کب یہ شان کریموں کے در کی ہے

بد ہیں مگر انھیں کے ہیں باغی نہیں ہیں ہم
نجدی نہ آئے اس کو یہ منزل خطر کی ہے

تف نجدیت نہ کفر نہ اسلام سب پہ حرف
کافر اِدھر کی ہے نہ اُدھر کی اَدھر کی ہے

حاکم، حکیم داد و دوا دیں یہ کچھ نہ دیں
مردود یہ مُراد کس آیت، خبر کی ہے

شکلِ بشر میں نورِ الٰہی اگر نہ ہو!
کیا قدر اُس خمیرۂ ما و مدر کی ہے

آ کچھ سُنا دے عشق کے بولوں میں، اے رضاؔ!
مشتاق طبع لذّتِ سوزِ جگر کی ہے

اداریہ

مسلم سلاطین ہند

اور موجودہ دورِ حکومت کا ایک تقابلی جائزہ

■ ڈاکٹر محمد امجد رضا امجد
قاضی شریعت مرکزی دار القضا ادارہ شرعیہ بہار پٹنہ

برصغیر پاک و ہند کی ہزار سالہ تاریخ متنوع سیاسی، سماجی اور مذہبی تبدیلیوں سے عبارت ہے۔ اس تاریخ میں دو ادوارِ حکومت خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جن کا تقابل موجودہ سیاسی اور سماجی منظرنامے کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے۔ ایک طرف مسلمانوں کا وہ طویل دورِ حکومت ہے جو سلاطینِ دہلی سے شروع ہو کر سلطنتِ مغلیہ کے زوال پر ختم ہوتا ہے، اور دوسری طرف اکیسویں صدی کا موجودہ جمہوری ہندوستان ہے جہاں پچھلی چند دہائیوں سے ایک مخصوص اکثریتی سیاست (Majoritarianism) حاوی ہے۔ موجودہ دور کے سیاسی پروپیگنڈے میں اکثر ماضی کے مسلم دور کو 'مذہبی جبر کا دور' کہہ کر پیش کیا جاتا ہے تاکہ موجودہ انتہاپسندی کو جواز فراہم کیا جا سکے۔ چنانچہ تاریخ کے آئینے میں ان دونوں ادوار کا غیر جانبدارانہ اور تحقیقی موازنہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے طرزِ حکومت کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ ان کی حکومتیں مذہبی بنیاد پر نہیں بلکہ سیاسی، اخلاقی اور رعایا پروری کے اصولوں پر قائم تھیں۔ انہوں نے انسانی جذبے کے تحت سبھوں کے ساتھ عادلانہ رویہ رکھا اور شریعت اسلامیہ کے اصولوں کے تحت اپنے یہاں کے غیر مسلم رعایا کی جان، مال اور عبادت گاہوں کے تحفظ کی ذمہ داری ریاست پر عائد کی۔ تاریخی حقائق پہ نگاہ رکھنے والوں سے مخفی نہیں مسلم بادشاہوں نے بلاتفریق مذہب و قوم اپنی رعایا کے مذہبی جذبات کا احترام کیا۔ سلطنتِ مغلیہ کے بانی ظہیر الدین محمد بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کے لئے جو وصیت نامہ لکھا، اس کے الفاظ آج بھی رعایا پروری و رواداری کی اعلیٰ مثال ہیں۔ بابر نے لکھا تھا:

> اے بیٹے! ہندوستان مختلف مذاہب کا مسکن ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں اس کی بادشاہت بخشی۔
> تمہیں چاہیے کہ تم اپنے دل سے مذہبی تعصب کو بالکل نکال دو اور ہر مذہب کے مروجہ طریقوں کے مطابق
> انصاف کرو، خصوصاً گائے کی قربانی سے پرہیز کرو تاکہ تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا سکو۔

بابر طرح جلال الدین اکبر کے دور میں اسی طرزِ حکومت کو اپنایا، جس نے یہاں کے مسلمانوں کے ساتھ دیگر اقوام کے درمیان سماجی رشتے کو مضبوط کیا۔ یہ ان کی سیاسی رواداری کی دلیل ہے کہ انہوں نے مندروں اور مٹھوں کے لئے شاہی خزانے

سے جاگیریں وقف کیں۔ بنارس کے پنڈتوں، امرتسر کے سکھوں کے ''گولڈن ٹیمپل'' اور ورنداون کے کرشن مندروں کو شاہی تحفظ اور وظائف دئے۔ اب اس کے بعد کوئی انہیں متعصب، جابر اور ان کے عہد حکومت کو مظلومیت کی مثال قرار دے، تو اسے تاریخی حقائق سے صرف نظر کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے۔

عظیم مغل شہنشاہ محی الدین اورنگزیب، جن پر خاص طور پر انگریز اور انتہا پسند ہنود متعصب ہونے کا الزام لگاتے ہیں، ان کے اس انعام خسروی کو بھی دیکھیں کہ انہوں نے بنارس، الٰہ آباد اور گوہاٹی کے مندروں کو جاگیریں وقف کیں۔ ان کا وہ فرمان بھی پڑھیں جو انہوں نے اپنے ایک مقامی افسر کے نام اس وقت لکھا جب بنارس کے پنڈتوں کو اس کے ذریعہ ہراساں کئے جانے کی خبر ملی، انہوں لکھا:

> ہمارے عدل پسند مزاج کے مطابق یہ طے پایا ہے کہ قدیم مندروں کو گرایا نہ جائے۔ اس لیے تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ کوئی بھی شخص ہندو رعایا اور وہاں کے برہمنوں کو بلا وجہ پریشان نہ کرے، تا کہ وہ پہلے کی طرح اپنے مندروں میں بیٹھ کر ہماری سلطنت کی بقا کے لیے دعا کرسکیں اور امن سے رہ سکیں''

کیا یہ فرمان ثابت نہیں کرتا کہ مغل بادشاہوں کے یہاں تحفظِ رعایا ریاست کی اولین ترجیح تھی۔ مذہبی جنونیت سے ان کا دور دور تک واسطہ نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو یہاں کی آبادی کا تناسب مذہبی اعتبار سے ایسا نہیں ہوتا۔

مسلم بادشاہوں کے نظام حکومت کا ایک اور پہلو جو آج کے متعصب حکمرانوں کے لئے چشم کشا ہے وہ حکومت میں غیر مسلموں کی شراکت، بڑے بڑے عہدوں پر ان کی تقرری اور ان پر بھرپور اعتماد ہے۔ انہوں نے اپنی مملکت کے ہنرمند، اہل دماغ اور سیاسی شعور رکھنے والے افراد کو قریب کیا، ان پر اعتماد کیا اور اعلیٰ عہدوں پر بحیثیت وزیر انہیں بحال کیا۔ چنانچہ تاریخ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ کشمیر کے ہندو پنڈت: سلطان زین العابدین کے دور میں وزارت اور علمی مناصب پر فائز تھے، راجہ ٹورمل: جلال الدین اکبر کے وزیر مالیات تھے۔ راجہ مان سنگھ: جلال الدین اکبر کی فوجوں کے سپہ سالار اعظم تھے۔ راجہ بربل (مہیش داس)، اکبر بادشاہ کے درباری مشیر تھے، بھگونت داس، اکبر کے امیر تھے، راجہ جسونت سنگھ، شاہجہاں کے فوجی سردار تھے اور راجہ جے سنگھ شہنشاہ اورنگ زیب کے سپہ سالار تھے۔ اسی طرح شیر شاہ سوری کی فوج کا نامور سپہ سالار، برہم جیت گوڑا، ایک ہندو تھا۔ مسلم حکمراں ہوتے ہوئے غیر مسلموں کے ساتھ یہ فراخ دلانہ رویہ بتاتا ہے کہ انہوں نے مذہب اور سیاست کے درمیاں ایک نمایاں فاصلہ رکھا تھا۔ اور وہ صلاحیت کو مذہب پر ترجیح دینے کے قائل تھے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلم بادشاہوں کا مقصد اگر یہاں اسلام پھیلانا ہوتا تو ان کے لئے آٹھ سو سال کا عہد حکومت بہت کافی تھا۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ آٹھ سو سال کی حکومت کے باوجود یہاں مسلمانوں کے بجائے غیر مسلم آبادی ہمیشہ اکثریت میں رہی۔ انگریزوں کے دور استعمار میں جب پہلی بار یہاں مردم شماری ہوئی تو پورے ملک میں مسلمانوں کی کل آبادی ۲۰ سے ۲۲ فیصد تھی۔ یہ سروے اس جھوٹے متعصب مورخین کے پروپیگنڈے کی تردید کرتا ہے کہ مسلم دور حکومت، ظلم و جبر کا دور تھا۔

دوسری طرف، جب ہم آزاد ہندوستان کے پچھلے چند سالوں کا موازنہ کرتے ہیں، تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ بعض حالیہ سیاسی رجحانات نے انصاف اور اقلیتی تحفظ کے حوالے سے سنجیدہ سوالات پیدا کردیے ہیں۔ یہاں کا آئین اگرچہ سیکولرازم اور مساویانہ حقوق

پر مبنی ہے مگر حکمراں طبقہ اسے قابل عمل سمجھتا ہی نہیں۔ یہاں کی جمہوری سیاست پر ہندوتوا کے اثرات کے حوالے سے سنجیدہ مباحث جنم لے رہے ہیں، اب جمہوریت کا مفہوم اکثریت کی بالادستی ہے جہاں اقلیتوں کو حاشیہ پہ لانے کی منظم کوشش کی جارہی ہے۔ ایک طرف آٹھ سوسالہ حکومت کی رواداری ہے اور ایک طرف چند سالوں پر مشتمل جمہوری آئین کے تحت حکمرانی، مگر دونوں کے طرز حکومت میں جو فرق ہے وہ عدل کے مقابلہ میں قتل، رواداری کے مقابلہ میں جفا کاری، اور انصاف کے مقابلہ میں حق تلفی ہے۔

آج جو لوگ اس ملک میں مذہبی شناخت کو سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں انہیں یا تو اپنے مذہبی تعلیمات کی خبر نہیں، یا پھر انھوں نے اپنے جرائم چھپانے کے لئے مذہبی نعرے کی پناہ ڈھونڈ لی ہے وجہ جو بھی ہو مگر اس سے ان کا مذہب بدنام ہو رہا ہے اس کا انہیں احساس ہونا چاہئے۔ انہیں اگر احساس نہیں، کہ وہ تو آمریت کے نشہ میں چور ہیں تو کم از کم ہندو عوام کو یہ احساس کرنا چاہئے کہ کیا ان کا مذہب اس طرح کے مظالم کی تعلیم دیتا ہے جس کا اظہار ظلم و تشدد، اجتماعی قتل، آبروریزی اور بلڈوزر کلچر کے ذریعہ کیا جارہا ہے؟ کیا اسی کا نام منوسمرتی اور ''دھرم کی بالادستی'' ہے؟ اقلیتوں پر ظلم کرنے والے اگر واقعی دھرم کا چشمہ لگا کر اگر اپنے مذہب کا مطالعہ کریں تو انہیں ان تعلیمات کی روشنی میں اپنے مجرم ہونے کا احساس ہوگا:

(۱) ''اہنسا'': ہندو تعلیمات ایک اہم اصول ''اہنسا پر مودھرما'' ہے، یعنی عدم تشدد ہی سب سے بڑا فرض ہے۔ ان کی مذہبی کتابوں میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ ''کسی بھی جاندار کو بلا وجہ ذہنی یا جسمانی اذیت دینا پاپ ہے'' مگر اس کے باوجود آج اسی قوم کے بعض افراد کسی جاندار نہیں، انسانوں کو جسمانی اذیت، ذہنی ٹارچر اور ہجومی تشدد کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ کیا اہنسا کی تعلیمات کا یہی مطلب ہے؟ اور کیا وہ اس طریق عمل سے اپنے مذہب کو بدنام نہیں کر رہے ہیں؟ اگر یہ سوال صحیح ہے تو پھر اس قوم کے پڑھے لکھے لوگ اس کے خلاف آواز کیوں نہیں اٹھاتے؟

۲۔ ''وسودھیو کٹمبکم'' کی نفی: ان کے مذہبی کتاب ایک پیغام: وسودھیو کٹمبکم یعنی ''پوری دھرتی ایک خاندان ہے''۔ اگر ان کے یہاں پوری دھرتی ایک خاندان ہے تو کیا خاندان میں توڑ پھوڑ مار دھاڑ، آگ زنی، اغوا کی وارداتیں انجام دی جاتی ہیں؟ خاندان والوں کو ہراساں کیا جاتا ہے اور انہیں جلاوطنی کی دھمکی دی جاتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر مذہب کے نام پر اقلیتوں کے ساتھ ایسا برتاؤ، مذہب پرستی ہے یا اپنے ہی مذہب سے عملی بغاوت؟

۳۔ منوسمرتی اور راج دھرم: ان کے قدیم شاستروں میں ''راج دھرم''، یعنی ''حکمران کے فرائض'' کی تعلیم ملتی ہے جس کے مطابق حکمران طبقہ کا فرض ہے کہ وہ اپنی رعایا کے درمیان بغیر کسی بھید بھاؤ (تفریق) کے انصاف کرے۔ اس کے نزدیک ساری رعایا کو ایک نگاہ سے دیکھنا اور ان کے درمیان عادلانہ رویہ رکھنا ایک حکمراں کی ذمہ داری ہے، مگر اس واضح پیغام کے باوجود کسی ایک طبقہ کی طرف داری اور کسی پر ظلم،، کسی کے جرم پر پردہ پوشی اور کسی کو نا کردہ جرم کی سزا، حکمراں طبقہ کو مناسب ہے؟ کیا موجودہ دور کا بلڈوزر کلچر اور یکطرفہ کارروائی، راج دھرم کے ان قدیم اصولو کے مطابق ہے؟ جسے آج کے حکمراں عبادت سمجھ کر انجام دے رہے ہیں۔ اس لئے اب یہ مان لینے میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہئے کہ موجودہ دور کی انتہا پسندی اور ان کے ظلم بربریت کا ہندو دھرم کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی لئے اس رویے کو 'منوسمرتی کے نام پر ایک سخت گیر سیاسی رجحان'' سے تعبیر کیا جانے

لگا ہے۔مگر اقتدار کے یہ بھوکے بھول گئے کہ حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے ،فضا بدلتی رہتی ہے، ماحول میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں اور انقلابات نے بڑے بڑے بادشاہوں کا نشہ ہرن کر دیا ہے ان کے مانگے ہوئے پانچ سالہ اقتدار کی کیا اہمیت ہے۔

دراصل بادشاہت اور حکمرانی سب کو زیب نہیں دیتی، اس کے لئے حوصلہ ہمت عدل وایثار داد ودہش اور عطاو بخشش والا دل چاہئے اور کردار سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ کون اس کا واقعی اہل ہے۔جن مسلم بادشاہوں کو آج کے متعصب افراد کوستے نہیں تھکتے ان کی تاریخ اس معاملہ میں واقعی چشم کشا ہے تاریخ ایک واقعہ بتاتی ہے کہ سلاطینِ دہلی کے دور میں سلطان غیاث الدین تغلق سے نادانستہ طور پر ایک ہندو بیوہ کا بیٹا زخمی ہو گیا۔وہ خاتون وقت کے قاضی (جج) کی عدالت میں پہنچ گئی۔قاضی نے بغیر کسی خوف کے وقت کے بادشاہ کو عدالت میں طلب کیا۔غیاث الدین تغلق ایک عام ملزم کی طرح عدالت میں پیش ہوا، اپنی غلطی تسلیم کی اور اس خاتون کو شرعی قانون کے مطابق معاوضہ دے کر راضی کیا۔بات ختم ہو گئی مگر ایک انصاف پسند بادشاہ کی کہانی ابھی باقی ہے ، کہ مقدمہ ختم ہونے کے بعد سلطان نے اپنے خنجر کی طرف اشارہ کر کے قاضی سے کہا کہ:

اگر تم بادشاہ سمجھ کر میرا لحاظ کرتے ،تو میں اس خنجر سے تمہارا سر قلم کر دیتا‘‘

قاضی نے بھی اپنے کوڑے پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا کہ:

’’اگر آپ عدالت کے احترام میں ذرا سی بھی ہچکچاہٹ دکھاتے ،تو میں اس کوڑے سے آپ کی پیٹھ نیلگوں کر دیتا‘‘

بادشاہ ہو کر رعایا کو انصاف دلانے کا یہ تیور، اور بادشاہ کے مقررہ کردہ قاضی کا بادشاہ کے خلاف یہ جرأت اظہار حق، ان حکمرانوں کے لئے لمحہ فکریہ ہے جو چند سالوں کی حکومت پہ خدا بننے کے نشہ میں چور ہیں اور ان ججوں کے لئے تازیانہ عبرت ہے جو جج بن کر انصاف کا گلا گھونٹنا اپنا منصبی حق سمجھ رہے ہیں، آخر تاریخ میں کون سا نقش چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں یہ لوگ؟ جو کام نہ اخلاقی وآئینی طور پر درست ہے، نہ ان کے مذہبی تعلیمات کے موافق، پھر مذہب کے نام پر ان متنازع اقدامات کا سبب آخر کیا ہے؟

دو عہدوں کے انداز حکومت کا یہ تحقیقی تقابل واضح کرتا ہے کہ ماضی کا مسلم نظام بالعموم رواداری، وسیع القلبی، استحکام اور تحفظ کا حامل تھا جب کہ آج کی نام نہاد جمہوریت میں مفقود ہو چکی ہے۔مسلم حکمرانوں نے ہندوستان کو اپنا وطن مانا، اس کی دولت کو یہیں خرچ کیا اور یہاں کی مقامی آبادی کو نظامِ حکومت کا حصہ بنایا۔اس کے برعکس، موجودہ دور کی سیاست نفرت اور تفریق کو بنیاد بنا کر ملک کے کثیر الثقافتی وجود کو پامال کر رہی ہے۔کیا یہاں پہنچ کر یہ کہنا بجا معلوم نہیں ہوتا کہ برصغیر میں مسلمانوں کا عہدِ حکومت موجودہ دور کے مقابلے میں اقلیتوں کے حقوق، سماجی امن اور مروجہ عدل کے اعتبار سے کہیں زیادہ محفوظ اور منصفانہ تھا؟ اگر حکمراں طبقہ اس سے بہتر طرز حکومت کی مثال قائم کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنے متعصبانہ انداز فکر کا احتساب کرنا چاہئے۔ورنہ تاریخ انہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔واضح رہے کہ اس پورے تقابلی مطالعے کا مقصد کسی ایک دور کو مکمل طور پر مقدس یا کسی دوسرے کو مکمل طور پر منفی ثابت کرنا نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ حکمرانوں پر اپنی رعایا کے تئیں کس قدر ذمہ داری، حساسیت اور جواب دہی لازم ہے اور یہی احساس آج کے دور کی اہم ترین ضرورت ہے۔

□□□

قارئین کے تاثرات

قارئین! مداحانہ نہیں، اپنے ناقدانہ وحقیقت پسندانہ تاثرات بھیجیں، یہ مجھے رسالہ کو خوب سے خوب تر بنانے میں معاون ثابت ہو۔

الرضا کا اداریہ عصری تقاضے کا اظہار ہے

مولانا غلام مصطفےٰ نعیمی

ایڈیٹر سہ ماہی السواد الاعظم دہلی، روشن مستقبل دہلی

سرزمین پٹنہ سے شائع ہونے والا دو ماہی الرضا انٹرنیشنل کا مارچ/اپریل 2026 کا شمارہ نگاہوں سے گزرا۔ حسب معمول رسالہ علمی وفکری اور اہم مضامین پر مشتمل ہے۔ آپ کا اداریہ مدارس اسلامیہ کا نصاب: فکری وراثت سے عملی قیادت تک" اسی دردو کرب اور فکر کا اظہار ہے جو ہر دردمند بابصیرت عالم دین کے دل میں ہوتا ہے۔ آپ نے واضح طور پر درست سوال اٹھایا ہے کہ مدارس کا موجودہ نصاب اٹھارویں صدی میں ترتیب دیا گیا تھا، جو اس عہد کی تمام ضرورتوں اور تقاضوں کا احاطہ کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نہ صرف مسلم بلکہ غیر مسلم بچے بھی مدارس میں تعلیم حاصل کرتے تھے اس کی بڑی واضح مثالیں مشہور ہندو سکالر راجہ رام موہن رائے اور آزاد ہندوستان کے پہلے پہلے صدر جمہوریہ راجیندر پرساد کے ناموں سے دی جاسکتی ہے جو مدارس ہی کے تعلیم یافتہ تھے۔ سوال اس بات کا ہے کہ آج ہم 21 ویں صدی کا ایک ربع حصہ گزار چکے ہیں اور دوسرے کی جانب رواں دواں ہیں۔ ایسے میں یہ سوال پوری شدت کے ساتھ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم موجودہ نصاب پر نظر کریں کہ کیا مذکورہ نصاب آج اس دور کی ضرورتوں اور اس کے تقاضوں کو پورا کر رہا ہے یا نہیں؟

جب ہم اس زاویہ سے دیکھتے ہیں تو یقیناً ہمیں اس چیز کا احساس ہوتا ہے کہ مدارس اپنے نصاب میں کچھ بنیادی تبدیلیاں تو چاہتا ہی ہے۔ اس وقت لبرلزم، فیمینزم ڈارون ازم جیسے نظریات ہمارے سامنے منہ کھولے کھڑے ہیں۔ جو مسلسل اسلام کے اصولوں کو چیلنج کر رہے ہیں اور اسلام کے ماننے والوں کے دل ودماغ کو متاثر کرنے کی ہر ممکن کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے آپ نے بڑی خوبصورت اور مدبرانہ گفتگو کی ہے۔ آپ نے جو نکات ہمارے سامنے رکھے ہیں اگر ان کا لحاظ کرتے ہوئے نصاب میں کچھ بنیادی تبدیلیاں کی جائیں تو اس کے بڑے مفید اثرات ہوں گے۔ ان میں سے ایک ہے طبائع طلبہ کی جانچ، فنون کا تخصص، عصری اور فکری چیلنجز کے مقابلے کے لیے نصاب میں بنیادی تبدیلیاں، ریاستی اور معاشی نظام سے آگاہی، ملکی قوانین، انسانی حقوق، شعبہ بینکاری اور ٹیکس نظام کی تعلیم جیسے اہم پہلو ہیں، جن پر اہل مدارس کو توجہ دینا چاہیے اور ضرورت کے مطابق ماہرین سے کچھ ایسے بنیادی اسباق/رسائل تیار کرائے جائیں جن کو رائج درس نظامی میں شامل کر کے مدارس کے طلبہ کو موجودہ دور کی ضرورتوں اور چیلنجز کے مقابلہ کرنے کے لائق بنایا جاسکے۔

اس کے علاوہ شمارے میں مفتی فیضان سرور مصباحی کا مضمون تفضیلیوں کو سنی قرار دینے کے نتائج" بھی نہایت اہم ہے۔ جس میں موصوف نے تفضیلیت کے عقیدے کو اہل سنت میں گھس پیٹھ کا چور دروازہ قرار دیا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کوئی بھی فتنہ ایک دم سے اپنی اصل شکل وصورت میں دکھائی نہیں دیتا۔ ابتدا میں ہر فتنہ نہایت چھوٹی سی صورت میں ہوتا ہے اور بہت غیر محسوس طریقے سے داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ جب لوگ اس سے زاویہ سے پہلو تہی برتتے ہیں تو پھر فتنہ

اپنی اصلی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ فیضان سرور مصباحی صاحب نے اخلاف اکابرین کے فرمودات وارشادات کے حوالہ جات سے یہ ثابت کیا ہے کہ اہل سنت میں تفضیلی نظریات ہی رافضی فتنوں کی وجہ بنتے ہیں انہوں نے ایک حالیہ واقعے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے یہ مضمون ترتیب دیا ہے مضمون اپنی فکر کے اعتبار سے بہت اہم ہے ضرورت ہے کہ اہل علم اس فتنے کا ادراک کریں۔ ہمارے خانقاہی حلقے تفضیلیت کے معاملے کو ہلکے میں نہ لیں۔ دور حاضر میں تفضیلیت ہی شیعت اور رافضیت کا دروازہ کھولتی ہے۔ عافیت اسی میں ہے کہ اہل سنت اسلاف کی راہ پر گامزن رہیں۔ شمارے کے دیگر مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ "الرضا" کی صدا کو اور پختگی و مضبوطی عطا فرمائے اور آپ کے قلم میں مزید روانی عطا فرمائے۔

***

الرضا: روایت اور جدت کا خوبصورت نمونہ ہے

مولانا شاہ ریان ابوالعُلائی

خانقاہ سجادیہ ابوالعُلائیہ، شاہ ٹولی، دانا پور

سہ ماہی الرضا عصرِ حاضر کے ان اہم دینی وفکری رسائل میں شمار ہوتا ہے جو علمی سنجیدگی، تحقیقی معیار اور فکری اعتدال کے ساتھ اردو دنیا میں اپنی نمایاں شناخت قائم کیے ہوئے ہیں، اس کے مدیر ڈاکٹر امجد رضا امجدؔ صاحب نہایت محنت، بصیرت اور ادبی شعور کے ساتھ اس رسالے کی ادارت انجام دے رہے ہیں، رسالے میں اسلامیات، فقہی مسائل، عقائدِ اہلِ سنت، افکارِ رضا، تصوف، اصلاحِ معاشرہ اور موجودہ حالات سے متعلق ایسے مضامین شامل کیے جاتے ہیں جو قارئین کی علمی وفکری رہنمائی کرتے ہیں۔

الرضا کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں روایت اور جدت کے درمیان خوبصورت توازن پایا جاتا ہے، رسالہ نہ صرف قدیم دینی ورثے کی حفاظت کرتا ہے بلکہ عصری مسائل کو بھی مدلل اور معتدل انداز میں پیش کرتا ہے، اس کے مضامین میں علمی گہرائی، تحقیقی انداز اور سادہ مگر مؤثر زبان پائی جاتی ہے جس سے عام قارئین کے ساتھ ساتھ اہلِ علم بھی بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔

یہ رسالہ اہلِ سنت کے صحیح عقائد ونظریات کی اشاعت میں اہم کردار ادا کر رہا ہے اور نئی نسل کے اندر دینی شعور پیدا کرنے کا مؤثر ذریعہ بن چکا ہے، فقہی وفکری مضامین میں دلیل، حوالہ اور تحقیق کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے جس سے رسالے کی علمی وقعت میں اضافہ ہوتا ہے، اس کے علاوہ موجودہ سماجی، مذہبی اور ملی مسائل پر بھی متوازن اور بامقصد گفتگو کی جاتی ہے جو قارئین کو غور وفکر کی دعوت دیتی ہے۔

ادبی اعتبار سے بھی رسالہ نہایت معیاری ہے، اس کی زبان شستہ، رواں اور دل نشیں ہے جبکہ طباعت وترتیب میں بھی سلیقہ اور حسنِ پیشکش نمایاں نظر آتا ہے، مجموعی طور پر الرضا ایک مفید، معیاری، فکر انگیز اور باوقار دینی وادبی مجلہ ہے جو اردو صحافت اور اسلامی فکر کی خدمت میں نہایت اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

***

نصاب سے متعلق اداریہ دعوت فکر وعمل ہے

مولانا محمد اشرف رضا قادری

مدیرِ اعلیٰ سہ ماہی امینِ شریعت)

مسلک اعلیٰ حضرت وجمہور علمائے اہل سنت کے افکار و نظریات کا ترجمان "الرضا انٹرنیشنل، پٹنہ" کا تازہ شمارہ (جنوری تا اپریل 2026ء) اپنی تمام تر رعنائیوں اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ صوری ومعنوی لحاظ سے عمدہ اور دیدہ زیب مجلہ نے اولِ نظر میں ہی اپنا گرویدہ بنالیا۔ جب اس کی ورق گردانی شروع کی اور شرفِ مطالعہ سے مشرف ہوا تو اس کے تقریباً سارے مضامین ومشمولات مفید، معلومات افزا اور فکر انگیز نظر آئے۔ جماعتی کرب اور ملی درد میں ڈوبا ہوا آپ کا فکر انگیز اداریہ بعنوان "مدارس اسلامیہ کا نصاب: فکری وراثت سے عملی قیادت تک" نے ذہن وفکر پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اداریہ کا یہ پیراگراف اہل سنت کے ارباب حل وعقد کو دعوتِ فکر وعمل دیتا ہے:

مدارس کے نصاب میں ایسے مباحث شامل کیے جائیں جو

نوجوان نسل کو الحاد، لبرل ازم اور فیمینزم جیسے جدید نظریات کے مدلل جوابات دینے کے قابل بنائیں۔ فارغین مدارس کو ملکی قوانین، انسانی حقوق اور پیچیدہ معاشی ڈھانچے (بینک کاری و ٹیکس نظام) کی بنیادی واقفیت دی جائے تاکہ وہ عملی دنیا میں اپنا مؤثر کردار ادا کر سکیں۔ مدارس کے ماہرین اور اہل بصیرت کے ساتھ مل کر ایک ایسا "جدید جامع نصاب" (National Curriculum) تیار کیا جائے جو مدارس کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔ اب یہ وقت محض گفتگو کا نہیں، بلکہ فیصلہ سازی کا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جو قومیں اپنے تعلیمی ڈھانچے پر بروقت غور نہیں کرتیں وہ دوسروں کے فکری نظام کا حصہ بن جاتی ہیں۔ مدارس اسلامیہ کو اپنی روح، اپنے مقصد اور اپنی شناخت کو محفوظ رکھتے ہوئے مستقبل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہونا ہوگا۔

ہمیں ایسا نصاب درکار ہے جو مسجد کے محراب میں بھی باوقار ہو اور عدالت کے ایوان میں بھی مدلل ہو، جو منبر پر بھی اثر رکھتا ہو اور گفت گو کی میز پر بھی وزنی ہو، جو عقیدہ کی حفاظت بھی کرے اور زمانے کی زبان بھی سمجھے۔ اگر ہم نے تدبر، جرأت اور اخلاص کے ساتھ یہ قدم اٹھالیا تو مدارس ایک نئے دور کی قیادت کریں گے اور اگر ہم نے تساہل اختیار کیا تو تاریخ ہمیں معاف نہیں کرے گی۔

سنی صحافت، جس کو عام طور پر برّ صغیر میں اسلامی یا دینی صحافت بھی کہا جاتا ہے، بیسویں صدی کے اوائل میں مسلمانوں کی دینی، تعلیمی اور سیاسی بیداری کے ساتھ پروان چڑھی۔ اس صحافت کا بنیادی مقصد اسلامی افکار و نظریات کی صحیح تصویر پیش کرنا، اہل سنت کے مراسم و معمولات کی نمائندگی کرنا اور ملک و معاشرہ میں خیر کی ترویج و اشاعت کے ساتھ امت مسلمہ کے سلگتے مسائل کو اجاگر کرتے ہوئے ان کے تدارک کے لیے لائحۂ عمل طے کرنا ہے۔ اس تناظر میں یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ آپ کے زیر ادارت شائع ہونے والے" رضا بک ریویو" اور" الرضا انٹرنیشنل، پٹنہ" نے سنی صحافت کو آب و تاب اور دین وسنیت کو توانائی بخشی ہے۔ سنی صحافت کے آسمان پر رسائل و جرائد کی شکل میں درجنوں ماہ و انجم طلوع ہوئے اور اپنی تابانیاں بکھیر کر غروب ہو گئے جو حد درجہ افسوس ناک ہے۔ ایسے میں" الرضا انٹرنیشنل" کا شائع ہونا اور اس کے بینر تلے دین وسنیت کے عروج و استحکام کا کام انجام پانا خوش آئند بات ہے، جس کے لیے آپ کی پوری ٹیم مشترکہ طور پر مبارک بادی کی مستحق ہے۔

سیرتِ طیبہ کے حوالے سے چاروں مضامین پسند آئے۔ بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لے چلنے کے لیے آج سیرتِ طیبہ کی روشنی کی سخت ضرورت ہے۔ مخدوم جہاں حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری قدس سرہ کی فقہی بصیرت کے حوالے سے مضمون بھی خوب ہے۔ اسی طرح مضمون "تفضیلیوں کو سنی قرار دینے کے نتائج" بھی حالاتِ حاضرہ کے تناظر میں خوب ہے۔ خانقاہوں اور ان کے باہر پنپ رہی رافضیت و وہابیت کو بے نقاب کرنا اس دور کا سب سے بڑا جہاد ہے اور یہ کام آپ بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ رضویات کے حوالے سے دونوں مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے رسالہ" الرضا " کو مزید عروج و استحکام بخشے اور آپ کی دینی وملی اور مسلکی خدمات کو شرف قبولیت بخشے آمین!

***

نصاب سے متعلق اداریہ فکر انگیز اور دعوت فکر و عمل ہے

■ مولانا محمد ظفر الدین برکاتی مصباحی
ڈائریکٹر برکاتی بک سینٹر (بی بی سی) دہلی شریف

مارچ اپریل 2026 کا مشترکہ شمارہ پی ڈی ایف فائل میں دیکھا، سب سے پہلے حضرت مفتی مطیع الرحمن مضطر رضوی صاحب کا فتویٰ" اللہ میاں کہنے کا مسئلہ اور شرعی حکم" کو پڑھا، ایمان وعقیدے کو روشنی ملی اور معلومات میں اضافہ ہوا۔ تنویر

سیرت کے تحت علامہ علوی مالکی علیہ الرحمۃ والرضوان کی تحریر "پیغمبر اسلام کے غیر ملکی سفیر صحابہ" کو رغبت سے پڑھا بلکہ ہر قاری کو سیرت وتاریخ اسلام سے متعلق مضامین کو بطور خاص پڑھنا چاہیے تاکہ ہم اپنی جڑوں سے جڑے رہیں نظریاتی اور عملی طور پر۔ ایک منفرد انداز کا مضمون "اعلیٰ حضرت اور درود یہ سیرت نگاری" بھی عقیدت افروز لگا جس میں فتاوی رضویہ جلد اول کے عربی خطبہ کی خوبیاں پڑھنے اور سمجھنے کو ملیں، ویسے اس موضوع پر ہم نے تین خطابات سن چکے ہیں اور اقبال شناس علامہ خادم حسین رضوی صاحب کا خطاب سب سے شاندار لگا۔

اوراق گم گشتہ کے تحت علامہ احمد سعید کاظمی صاحب کی تحقیقی تحریر "انک لاتھدی من احببت کا صحیح مفہوم" کو بطور خاص پڑھا کیوں کہ بہت پہلے ہم نے اس موضوع پر مقالہ لکھا تھا جو ماہ نامہ کنز الایمان دہلی کے کسی شمارے میں شائع ہوا۔ ہدایت کے مختلف پہلوؤں پر میں نے تین مقالے لکھے ہیں لیکن مجھے بھی وہ تحریریں دستیاب نہیں۔

نصاب مدارس سے متعلق دو مضامین کو بھی پڑھا جس میں "حالات کے تناظر میں مدارس کے نصاب میں تجدید کی ضرورت" پر خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک بات میرے ذہن گردش کرتی ہے کہ ہر حساس موضوع پر نوجوان نسل کو لکھنے بولنے اور تجدید وتبدیلی سے متعلق خیالات واندیشے پیش کرنے کی ضرورت ہے لیکن ہمارے اکابر جلدی پیش قدمی نہیں کرتے اور جب پانی سر سے گزرنے لگتا ہے تب افراتفری مچ جاتی ہے اور منصوبہ بندی کے بغیر کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے۔ خاص کر ایسے ماحول میں جب تجدید کی بات کرنے والے کم ہوتے ہیں اور تبدیلی کا مطالبہ کرنے والے کثرت سے لکھتے اور بولتے ہیں۔ میرے خیال سے دینی مدارس کے نصاب تعلیم کی تبدیلی سے متعلق لکھے مضامین ومقالات اور مطبوعہ خطابات کو جمع کیا جائے تو تین چار جلدیں تیار ہو جائیں گی لیکن اقدام وعمل کی زمین پر اثرات نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی، اس کا مطلب ہے کہ بے چینی میں خلوص نہیں اور زیادہ تر لکھنے بولنے والوں کی نیت صاف نہیں ورنہ حرکت ضرور ہوتی اور برکتیں بھی نظر آتیں

سب سے اخیر میں اداریہ دیکھا، عنوان ہی ایسا ہے کہ پڑھنا پڑا "مدارس اسلامیہ کا نصاب تعلیم۔ فکری وراثت سے عملی قیادت تک" شاندار لکھا ہے آپ نے۔ اب ہمیں ایک بات شدت سے اور سلیقے سے نوجوان نسل بلکہ درس نظامی کے طلبہ وطالبات کے دل ودماغ میں ڈالنے اور سمجھالے جانے کی ضرورت ہے کہ مدارس کا نصاب تعلیم منزل اور مقصد نہیں بلکہ منزل ومقصد تک پہنچنے کا وسیلہ ہے اور دنیا کا کوئی بھی نصاب منزل ومقصد نہیں ہوتا، نصابی کتابیں اور موضوعات بھی منزل نہیں ہوتے بلکہ منزل ومقصد تک جانے والی شاہراہ کا سنگ میل ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ کوئی بھی مسافر سنگ میل پر کھڑا نہیں ہوتا بلکہ اس کی رہنمائی میں آگے بڑھتا ہے اور سنگ میل کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے کیونکہ اس کا مقصد پورا ہو گیا۔ اس تناظر میں نصاب تعلیم کو دیکھا جائے اور طلبہ وطالبات کے ذہنوں میں صحیح صورت حال بٹھا دی جائے تو آگے کی بات سمجھنے اور سمجھانے میں آسانی ہوگی۔

اپنے طلبہ اور طالبات کو بتانے کی ضرورت ہے کہ اسکول وکالج کے پانچ، آٹھ، دس اور بارہ سالہ نصاب تعلیم میں شامل کتابوں اور موضوعات کو پڑھنے کے بعد بھی کسی خاص منزل ومقصد کو پانے کے لئے اور سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے الگ سے تین چار بلکہ پانچ سال تک مستقل مزاجی سے مسلسل تیاری کرنا ہوتا ہے تب کہیں نیٹ (neet) اور نیٹ (net) یو جی، یو پی ایس سی، پی ایس سی، ایس ایس سی، این ٹی اے، آئی بی پی ایس اور بہت سے دیگر مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیابی حاصل کرتے ہیں، اس کے بعد بھی منزل ومقصد تک پہنچنے کے تین چار مراحل ہوتے ہیں تو صرف مدارس کے نصاب تعلیم کو موضوع بحث بنانا عقل مندی نہیں بلکہ مسائل کو حل کرنے کی بجائے مسائل میں الجھانا ہے اور بس۔

مجموعی طور پر پورا شمارہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے اور آپ کی ادارتی خوبیوں کا نمونہ ہے۔ مجھے آف لائن پڑھنے کی عادت ہے لیکن آج کل پوری جماعت اہل سنت میں دو تین رسالے ہی آف لائن ہیں، اس

لئے آن لائن مجبوری ہے، اس لئے پڑھ لیتے ہیں کچھ۔ فقط

* * *

الرضا صرف رسالہ نہیں ایک تحریک ہے

■ مولانا پھول محمد نعمت رضوی: برہمپوری سرلاہی نیپال

بلاشبہ الرضا انٹرنیشنل صرف ایک رسالہ نہیں بلکہ اہل سنت والجماعت کی ایک زبردست کامیاب تحریک ہے جو کرونا مہاماری کے وقت حالات سے دوچار ضرور ہوئی تھی لیکن فکر رضا کے اشاعت کا جذبۂ بے کراں رکھنے والے جیالوں نے اسے پھر زندہ کیا اور اب یہ پھر اسی پرانے آب وتاب کے ساتھ اپنے مشن میں لگا ہوا ہے بس ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے آپ اور ہم سب مل کر اور بھی موثر ترین بنائیں مسلک اعلی حضرت اور جمہور علمائے اہل سنت کے افکار ونظریات کا یہ ترجمان جنوری تا اپریل ہماری نظروں کے سامنے ہے میری خوشیوں کی انتہا نہیں جب اسے دیکھا طبیعت مچل گئی بہترین کاغذ خوبصورت ٹائٹل پیج اور مدیر اعلیٰ ڈاکٹر امجد رضا صاحب کی انتھک محنت دل سے دعائیں نکلیں مدیر اعلی ڈاکٹر محمد امجد رضا امجد کا لکھا اداریہ بنام ''مدارس اسلامیہ کا نصاب فکری وراثت سے علمی قیادت تک'' جسے پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ الرضا جنوری تا اپریل کی جان ہو ڈاکٹر امجد رضا امجد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

مدارس کا ایک وہ دور تھا جب مدارس بادشاہوں کے خزانے سے چلا کرتے تھے ان کے سرپرست بادشاہ یا وزیر ہوا کرتے تھے اور علماء ومدرسین کی تنخواہیں شاہی خزانے سے ادا ہوتی تھی جامعۃ القرویین مراکش، جامعۃ الازہر قاہرہ، جامعہ قرطبہ اندلس، مدرسہ نظامیہ بغداد، مدرسہ معزی دہلی، مدرسہ فیروز شاہی دہلی، مدرسہ الغ بیگ سمرقند، ایسے ہی مدارس ہیں جنہیں امراء اور سلاطین کی سرپرستی حاصل رہی اور ان مدارس نے اپنے اپنے عہد میں دینی قیادت کے ساتھ ساتھ سلطنت کے امور سنبھالنے والے افراد اور حدیث وتاریخ وتفسیر پہ گراں قدر کام کرنے والی عظیم شخصیات کے ساتھ سائنسی علوم میں مہارت رکھنے والے جیالے پیدا کیے دور خلافت سے مغلیہ عہد تک مدارس کی شان رہی مگر مغل دور کے خاتمہ کے ساتھ ہی مدارس کا وہ دور اختتام کو پہنچا اور اسے اپنی بقا کے لیے ایک نہ ختم ہونے والی جدوجہد زکوۃ کی وصولی کا سہارا لینا پڑا علمائے اسلام نے نیابت رسول کا فریضہ انجام دیتے ہوئے بڑی خوبصورتی سے اسلام کے نظام زکوۃ سے فائدہ اٹھایا اور زکوٰۃ کے مستحقین کی فہرست میں شرعی، حدود وضوابط، کی قید کے ساتھ مدارس اسلامیہ کو شامل کیا آج تین سو سال سے جس میں انگریزوں کا دور استعمار شامل ہے علماء نے عوامی تعاون سے اپنے مدارس کو کھڑا رکھا ہے گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تین سو سال سے اسلام کے نظام زکوۃ نے اسلام کو بچا کے رکھا ہے اگر یہ نظام نہ ہوتا تو مدارس اسلامیہ تاریخ کے مقبرے میں دفن ہو گئے ہوتے یہ محض مالی نظام نہیں بلکہ امت اور دین کے درمیان ایک روحانی معاہدہ ہے

کل ملا کر بے حد مفید اور کارآمد داریہ ہے جس سے سب کو خاص طور سے اہل مدارس کو پڑھ کر اس پر عمل پیرا ہونا ہی چاہیے اور جن لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کے اس اداریے کو نہیں پڑھا اسے چاہیے کہ اس رسالے کو حاصل کر کے ایک بار ضرور پڑھیں

قارئین کے تاثرات بھی بہت عمدہ اور حوصلہ افزا ہے پھر علمی فقہی سلسلہ اور بڑے عمدہ عمدہ مضامین کا ایک سلسلہ ہے اور پھر تفضیلیوں کو سنی قرار دینے کے نتائج حالات کے تناظر میں مدارس کے نصاب میں تصدیق کی ضرورت پر مباحثہ قابل دید ہے۔

گویا کہ ہر خوبیوں سے مزین ومرصع ایک خوبصورت دلنشین واقعی ایک تحریکی یہ رسالہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے نظر بد سے محفوظ رکھے اور مزید ترقیاں نصیب فرمائے۔

* * *

آپ کا سوال

الرضا انٹرنیشنل کا ایک علمی فقہی سلسلہ ''آپ کا سوال''

کیا فتاویٰ رضویہ اور بہار شریعت کے مسائل میں تعارض ہے؟

جوابات: مناظر اہل سنت فقیہ النفس حضرت مفتی محمد مطیع الرحمن رضوی
بانی و سربراہ: جامعہ نوریہ شام پور، رائے گنج، بنگال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

استاذ گرامی حضرت فقیہ النفس صاحب قبلہ، اطال اللہ تعالی ظلک و افاض علینا فیوضک!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!!

کچھ دنوں پہلے سوشل میڈیا پر سجدۂ تلاوت کے بارے میں ''بہار شریعت'' اور ''فتاوی رضویہ'' کے اندر کھُلا ہوا تعارض کا مسئلہ خوب گردش کرتا رہا مگر کسی نے اس تعارض کو دفع کیا ہو نظر میں نہیں آیا۔ میں بھی اپنے طور پر مسلسل غور کرتا رہا مگر کوئی جواب سمجھ میں نہیں آیا۔ اب مجبوراً حضور کو زحمت دے رہا ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ حسب سابق اب بھی حضور والا کرم فرمائیں گے اور اپنے اس ناچیز شاگرد کو ضرور نوازیں گے۔ والسلام

حضور کا ادنی شاگرد
(مفتی) احسن رضا
باتھ اصلی، ضلع سیتا مڑھی (بہار)

بہار شریعت حصہ: ۴، مسئلہ: ۹، میں ہے:

جو شخص نماز میں نہیں اور آیت سجدہ پڑھی اور نمازی نے سنی تو بعد نماز سجدہ کرے، نماز میں نہ کرے (غنیۃ، عالمگیری)

جب کہ فتاوی رضویہ مترجم، ج: ۲۲، ص: ۴۰۹، میں ہے:

مصافحہ سنت ہے۔ اور اس کا وقت ابتدائے ملاقات ہے خواہ ابتدائے حقیقی ہو جیسے جو شخص ابھی آیا۔ یا حکمی جیسے کوئی بدمذہب آیا اور بیٹھا اور گفتگو کرتا رہا، اور ہدایت پائی اور سنّی ہوا، تو جتنے حاضرین اہل سنّت ہیں اُن سب کو اس سے مصافحہ چاہیے جیسا کہ امیر المؤمنین مولا علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے اس کا حکم دیا۔ نماز کے بعد بھی مصافحہ اسی ابتدائے حکمی میں داخل ہے کہ نمازی نماز میں دوسرے عالم میں ہوتا ہے، ولہٰذا جو خارج نماز آیت سجدہ کی تلاوت کرے، اس کے سننے سے نمازی پر سجدہ واجب نہیں۔ اور نمازی تلاوت کرے تو جو نماز سے باہر ہے اس پر بھی واجب نہیں۔ اسی لیے شریعت مطہرہ میں ختم نماز میں ایک دوسرے پر سلام رکھا۔ دن میں اگر کئی بار ملتا ہو تو ہر بار مصافحہ چاہیے۔

الجواب

عزیز محترم مفتی احسن رضا صاحب، وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

فتاوی رضویہ مترجم میں یہ سوال وجواب، غیر مترجم کی جلد دہم نصف آخر صفحہ ۸۹، ۹۰ سے منقول ہیں۔ جس کے ناشر جناب قربان علی رضوی حامدی ہیں، انھوں نے پیش لفظ میں لکھا ہے:

یہ جلد ہمیں خستہ حالت میں ملی۔ کہنگی کی وجہ سے کہیں کہیں کاغذ گل گیا۔ کچھ اوراق ضائع ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے ایک رسالہ اور کچھ سوال ناقص ملے جن کو نامکمل ہی شائع کر دیا ہے۔ جہاں اوراق بوسیدگی کی وجہ سے پھٹ گئے یا لفظ سمجھ میں نہیں آیا اس کی عبارت کی جگہ بیاض چھوڑ دی ہے۔ جہاں جہاں سمجھ سے ایک دو لفظ لکھا ہے اس کو قوسین میں گھیر دیا ہے۔ مسودہ کی نقل کا کام جناب ڈاکٹر محمد فیضان علی صاحب پسر اکبر جناب مولانا مولوی عرفان علی صاحب رضوی مرحوم مغفور نے بڑی محنت سے کیا اس کے بعد کتابت کرائی گئی الخ

کسی ایسی فنی کتاب سے نقل وایڈٹ کا کام، کوئی اس فن کا جان کار ہی جاں فشانی سے کرے، تو غالب گمان ہوتا ہے کہ معنوی خامیاں نہیں ہوں گی، ورنہ غلطیاں در آنے کا کافی امکان رہ جاتا ہے۔ علامہ سعد الدین تفتازانی (م ۷۹۳) کی کتاب ''مختصر المعانی'' کے صفحہ ۸۷ پر قرآن کریم کی آیت ''ورفع بعضھم درجٰت'' کے نقل کرنے میں ناقل سے غلطی ہوگئی ہے اور ''رفع بعضھم'' کے بعد ''درجٰت'' سے پہلے ''فوق بعضھم'' کا اضافہ ہو گیا ہے۔ یوں ہی علامہ عبد الرحمٰن جامی (م ۸۹۸) کی کتاب ''فوائد ضیائیہ'' معروف بہ ''شرح جامی'' کے صفحہ ۸۱ پر آیت کریمہ :ان الذین کفروا وماتوا وھم کفار فلن یقبل من احدھم ملء الارض ذھباً'' کے نقل کرنے میں ناقل سے غلطی ہوگئی ہے اور ''من احدھم ملء الارض ذھباً'' رہ گیا ہے۔ مستزاد یہ کہ ''توبتھم'' کا اضافہ بھی ہو گیا ہے۔

تو کیا بعید کہ مسودہ سے اس جواب کو نقل کرنے میں جناب ڈاکٹر محمد فیضان علی سے ہی ایسا ہو گیا ہو۔ اور اگر مسودہ میں بھی ایسا ہی رہا ہو، تو چوں کہ اصل فتاوی سے رجسٹر میں نقل کا کام امام احمد رضا خود نہیں کرتے تھے، اس کے لیے الگ آدمی تھا۔ اس لیے ممکن ہے پہلے ہی ناقل سے ایسا ہو گیا ہو۔

''فتاویٰ رضویہ،، ہی میں اس طرح کے بعض مقامات کی نشان دہی اور تصحیح کا فریضہ اس فقیر نے ''حیات اعلی حضرت'' پر اپنی ''عرض گفتنی،، میں پہلے بھی انجام دے چکا ہے۔ جس کے ملاحظہ کے بعد حضرت تاج الشریعہ علیہ الرحمہ نے یہ تحریر فرمایا ہے:

''حیات اعلی حضرت مکمل'' عنقریب پہلی مرتبہ منظر عام پر آرہی ہے۔ مولانا المحترم مفتی محمد مطیع الرحمٰن صاحب مضطر رضوی نے جس جدوجہد سے اسے حاصل کیا، پھر اس کی ترتیب وتہذیب، تصحیح وتحشیہ اور فہرست سازی میں جو عرق ریزیاں فرمائیں، ان کے لیے وہ مبارک باد اور لائق صد ستائش ہیں۔

حضرت مولانا موصوف نے چند مقامات مجھے دکھائے جہاں توقیت کے حساب میں ہندسے غلط چھپ گئے تھے، اور ترتیب میں بہت الٹ پھیر کاتب کی غلطی سے ہو گیا تھا۔ الحمد للہ! انھوں نے حیات اعلی حضرت کے ساتھ ساتھ

فتاویٰ رضویہ میں بھی ان غلطیوں کی تصحیح کردی۔ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب موصوف کو بہتر جزا اس عمل خیر کی عطا فرمائے الخ۔

فقیر محمد اختر رضا قادری ازہری غفرلہ

۲۳ جمادی الثانی ۲۳ ہجری (حیات اعلیٰ حضرت، حصہ سوم ،مطبوعہ رضا اکیڈمی بمبئی)

یہاں بھی فقیر کی سمجھ کے مطابق اصل فتوی میں ''ولہذا '' کے بعد عبارت: ''**بعض ائمہ کے نزدیک**'' رہی ہوگی، جو ناقل سے نقل کرنے میں رہ گئی۔

اس تقدیر پر فتوے کی عبارت یوں ہوتی ہے:

مصافحہ سنت ہے۔ اور اس کا وقت ابتدائے ملاقات ہے خواہ ابتدائے حقیقی ہو جیسے جو شخص ابھی آیا۔ یا حکمی جیسے کوئی بدمذہب آیا اور بیٹھا اور گفتگو کرتا رہا، اور ہدایت پائی اور سنّی ہوا، تو جتنے حاضرین اہل سنّت ہیں اُن سب کو اس سے مصافحہ چاہیے جیسا کہ امیر المؤمنین مولا علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے اس کا حکم دیا۔ **نماز کے بعد بھی مصافحہ اسی ابتدائے حکمی میں داخل ہے کہ نمازی نماز میں دوسرے عالم میں ہوتا ہے، ولہذا بعض ائمہ کے نزدیک جو خارج نماز آیت سجدہ کی تلاوت کرے، اس کے سننے سے نمازی پر سجدہ واجب نہیں۔ اور نمازی تلاوت کرے تو جو نماز سے باہر ہے اس پر واجب نہیں۔ اسی لیے شریعت مطہرہ میں ختم نماز میں ایک دوسرے پر سلام رکھا۔ دن میں اگر کئی بار ملتا ہو تو ہر بار مصافحہ چاہیے۔**

اور بلا شبہہ بعض ائمہ کے نزدیک خارج نماز سے آیت سجدہ کی تلاوت سن کر نمازی پر، اور نمازی سے سن کر خارج نماز پر سجدہ واجب نہیں ہے۔

امام ابوالقاسم ہذیلی شافعی (م ۴۶۵ھ) کی ''الکامل فی القراءات العشر''ص: ۴۷۷ میں ہے:

لو سمعها المصلی من غیرہ او غیر المصلی من المصلی لم یجب علیه السجود ۰

[نمازی پر غیر نمازی کی تلاوت سے اور غیر نمازی پر نمازی کی تلاوت سے سجدہ واجب نہیں]

یہاں کسی کو اعتراض ہو کہ سائل دوسرے مذہب کا ہو تو مفتی پر لازم ہے کہ فتوی اپنے ہی مذہب کے مطابق دے۔ تو پھر امام احمد رضا نے دوسرے ائمہ کے مذہب کے مطابق فتوی کیوں دیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں استفتا، سجدۂ تلاوت کے بارے میں نہیں ہوا ہے، بلکہ مصافحہ سے متعلق ہوا ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:

ان لوگوں کو جو دوسرے دن یا روزمرّہ بلکہ کبھی ایک دن میں چند بار بھی ملنے کا اتفاق پڑتا ہو، اُن کو بعد سلام اور جوابِ سلام کے، اگرچہ دوسرا شخص اپنے کام ضروری میں مصروف ہو مگر مصافحہ کرنا بھی امر ضروری ہے؟ دیگر یہ کہ مصافحہ کون کون سے موقعوں پر کرنا ضروری ہے۔ اور مصافحہ فرض ہے۔ یا واجب۔ یا سنت؟

اور امام احمد رضا نے فتوی، اسی کے تعلق سے عطا فرمایا ہے ،سجدہ کے تعلق سے نہیں۔ آپ کے الفاظ ہیں:

مصافحہ سنت ہے۔ اور اس کا وقت ابتدائے ملاقات ہے خواہ ابتدائے حقیقی ہو جیسے جو شخص ابھی آیا۔ یا حکمی جیسے کوئی بدمذہب آیا اور بیٹھا اور

گفتگو کرتا رہا، اور ہدایت پائی اور سنّی ہوا۔ تو جتنے حاضرین اہل سنّت ہیں اُن سب کو اس سے مصافحہ چاہیے جیسا کہ امیر المؤمنین مولا علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے اس کا حکم دیا۔ **نماز کے بعد بھی مصافحہ اسی ابتدائے حکمی میں داخل ہے۔ کہ نمازی نماز میں دوسرے عالم میں ہوتا ہے، ولہٰذا بعض ائمہ کے نزدیک جو خارج نماز آیت سجدہ کی تلاوت کرے، اس کے سننے سے نمازی پر سجدہ واجب نہیں۔ اور نمازی تلاوت کرے تو جو نماز سے باہر ہے اس پر واجب نہیں۔ اسی لیے شریعت مطہرہ میں ختم نماز میں ایک دوسرے پر سلام رکھا۔ دن میں اگر کئی بار ملتا ہو تو ہر بار مصافحہ چاہئے۔** واللہ تعالی اعلم

یعنی مصافحہ کا وقت ابتدائے ملاقات ہے، اور بعد نماز حقیقۃً اس کا تحقق نہیں ہوتا، تو پھر بعد نماز مصافحہ کیوں کر مشروع ہوا؟ امام احمد رضا نے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ابتدائے ملاقات عام ہے خواہ حقیقی ہو یا حکمی، اور نماز کے بعد اگر چہ ابتدائے ملاقات حقیقتاً نہیں ہوتی، مگر حکماً ہوتی ہے، وہ اس طور پر کہ اندرون نماز اور خارج نماز کا عالم حکماً ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ چنانچہ شوافع کے ہاں اندرون نماز و خارج نماز میں سے کسی ایک حالت میں آیت سجدہ کی تلاوت سے دوسری حالت میں سجدہ واجب نہیں ہوتا ہے۔ جس کی حکمت وہی اندرون نماز و خارج نماز کا حکماً مختلف ہونا ہے۔

اور جب دونوں عالم حکماً مختلف ہیں تو نمازی جب نماز سے فارغ ہوگا، تو ایک عالم سے نکل کر دوسرے عالم میں داخل ہو جائے گا، اور اس عالم میں دوسرے نمازی سے اس کی ملاقات، ابتداءً ہوگی۔ اور جب ابتدائے ملاقات کا تحقق ہو گیا خواہ حکماً ہی سہی تو اب اس کے لیے مصافحہ بھی مشروع ہوگا ـــــ اور بعدِ نماز ہی کی طرح چوں کہ وقفہ وقفہ سے ملنے کی صورت میں بھی حکماً ابتدائے ملاقات کا تحقق ہو جاتا ہے، لہٰذا اس صورت میں بھی مصافحہ چاہیے!

جس طرح حضرات شوافع کے ہاں سجدۂ تلاوت کے مسئلے میں اندرون نماز و خارج نماز کے عالم کو حکماً مختلف اعتبار کیا گیا ہے، اسی طرح نماز کے بعد مصافحہ کی مشروعیت بھی دونوں عالم کے حکماً مختلف اعتبار کیے جانے کی وجہ سے ہے، لہٰذا اس مناسبت کی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے نظیر کے طور پر سجدۂ تلاوت کے مسئلے کو پیش فرما دیا ہے۔

جاننا چاہیے کہ نظیر، شبیہ اور مثیل، از روئے لغت اگر چہ ہم معنی ہیں مگر اصطلاحاً اُن میں فرق ہے۔ مثیل اخص ہے، شبیہ اعم اور نظیر اعم العام؛ کیوں کہ مثیل میں برابری ہوتی ہے، شبیہ میں کچھ کمی بیشی ہو سکتی ہے، اور نظیر میں تو معمولی مناسبت ہی کافی ہے۔

فتاوی حدیثیہ، ص: ۱۹۳ میں ہے:

الشبيه والمثيل والنظير متحدة لغة۔ واما اصطلاحاً فظاهر قول شرح العقائد عن الاشعرية المماثلة انما تثبت عندهم بالاشتراک فى جميع الاوصاف ان المثيل اخصها، لان المماثلة تستلزم المشابهة وزيادة ،والشبيه اعم من المثيل واخص من النظير، والنظير اعم من الشبيه ؛اذ المشابهة لاتستلزم المماثلة فقد يكون شبه الشئ غير مماثل له، والنظير قد لايكون مشابها۔ والحاصل ان المماثلة تقتضى المساواة من

كل وجه ،والمشابهة تقتضي ذلك في الاكثر، والمناظرة تكفي في وجه۔

[لغت میں شبیہ، مثیل اور نظیر ہم معنی ہیں۔ اصطلاحی اعتبار سے شرح عقائد میں اشاعرہ کے حوالے سے جو کہا گیا ہے، اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ مماثلت ان حضرات کے نزدیک تمام اوصاف میں اشتراک سے ثابت ہوتی ہے تو مثیل اخص ہوئی؛ کیوں کہ مماثلت میں بہت زیادہ مشابہت کا استلزام ہوتا ہے۔ شبیہ، مثیل سے اعم ،اور نظیر شبیہ سے بھی اعم ہے؛ کیوں کہ مشابہت مماثلت کو مستلزم نہیں ہوتی ہے؛ کیوں کہ مماثلت کے بغیر بھی شبیہ کا تحقق ہو جاتا، اسی طرح کبھی نظیر کا بھی تحقق مشابہت کے بغیر ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مماثلت ہر طور سے مساوات چاہتی ہے اور مشابہت اکثر چیزوں میں مساوات کی مقتضی ہوتی ہے جب کہ مناظرت میں ادنیٰ مناسبت کافی ہوتی ہے۔]

اب رہی یہ بات کہ ابتدائے حکمی کا تحقق، اندرون نماز و خارج نماز کے عالَم کو مختلف اعتبار کرنے سے ہوتا ہے، اگر حکماً مختلف اعتبار نہ کیا جائے تو ختم نماز پر ابتدائے حکمی کا تحقق ہی نہ ہو سکے گا، حالاں کہ ہم نے انھیں (یعنی اندرون نماز اور خارج نماز کے عالَم کو) مختلف تسلیم کیا ہے، ورنہ بعد نماز نہ ابتدائے حکمی کا تحقق ہوگا، نہ مصافحہ مشروع۔ اور جب شوافع کی طرح ہم نے بھی دونوں عالم کو مختلف اعتبار کیا ہے تو اختلاف عالم کی بنا پر جس طرح شوافع کے ہاں سجدہ واجب نہیں ہوتا ہے، اسی طرح ہمارے ہاں بھی واجب نہیں ہونا چاہیے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ صورت مذکورہ میں، عالم کا اختلاف سجدۂ تلاوت کے عدم وجوب کی حکمت ہے، علت نہیں۔ اور حکمت وعلت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ حکم کا مدار علت پر ہوتا ہے، حکمت پر نہیں۔

''نہایہ''، ''عنایہ'' پھر فتح القدیر باب العدۃ، ج ۴ ص ۱۶۵ میں ہے:

الحكم يدور مع العلة لا الحكمة

[حکم علت کے ساتھ دائر ہوتا ہے حکمت کے ساتھ نہیں]

جیسے نماز میں قصر، اور رمضان میں افطار (روزہ نہ رکھنا) کی علت مسافرت ہے، اور مشقت وحرج ان کی حکمت و مصلحت۔ تو اگر شہنشاہ وقت تفریح کے لیے بھی ۹۳ کیلومیٹر کی مسافت پر پندرہ دن سے کم اقامت کے ارادہ سے سات ستارہ ہوٹل میں ٹھہرے، جہاں مشقت وحرج کا شائبہ تک نہیں ہوتا، پھر بھی اس کے لیے قصر وافطار مشروع ہے۔ اور غریب سے غریب تر آدمی ۹۱ کیلومیٹر کی مسافت پر فٹ پاتھ پر پڑا رہے جہاں سراسر حرج ومشقت ہی ہے، پھر بھی اس کے لیے قصر وافطار مشروع نہیں۔

پھر علت کا حکم ''اصل'' میں جس طرح کا ہوتا ہے ''فرع'' میں بھی اسی طرح کا ہوتا ہے، جب کہ حکمت و مصلحت کے حکم کا ایک طرح ہونا ضروری نہیں ہے، اس لیے حکمت کے یکساں ہونے کے باوجود کسی شے کا حکم میں مختلف ہونا مستبعد نہیں، چنانچہ احناف کے ہاں مسافرت کی حالت میں قصر واجب ہے، اور شوافع کے ہاں محض رخصت۔ هٰذا ما ظهر لي ولعل الله يحدث بعد ذٰلك امراً۔

فقیر محمد مطیع الرحمٰن رضوی غفرلہ

علامہ فضل حق خیرآبادی

عظیم فلسفی یا زبردست اسلامی متکلم؟

علامہ محمد احمد مصباحی
ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور

علامہ فضل حق خیرآبادی (۱۲۱۲ھ/ ۱۷۹۷ء ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) نے علم وفن کی مختلف شاخوں اور زندگی کے متعدد شعبوں میں اپنے فضل وکمال کے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ منطق و فلسفہ، فقہ وکلام اور شعروادب ہر میدان میں ان کی علمی برتری کے آثار آج بھی نظر آتے ہیں۔ درس وتدریس اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ مدت العمر رہا۔ لیکن ایسا نہیں کہ وہ صرف درس گاہ میں محصور اور لائبریری میں گوشہ نشین ہو کر عوامی زندگی اور ملکی سیاست سے بے تعلق رہے ہوں۔ نہیں نہیں۔ بلکہ سرزمین وطن کو ظالم حکمرانوں سے بچانے اور ابنائے وطن کو غیروں کی غلامی سے آزاد رکھنے کی راہ میں انھوں نے جو مجاہدانہ کردار پیش کیا ہے وہ ان کی زندگی کا ایسا درخشاں باب ہے جو تمام اہل ہند کی جانب سے ہزارہا خراج تحسین اور شکر وسپاس کا حقدار ہے۔ مگر یہاں میری گفتگو ان کی علمی زندگی اور فکری وقلمی آثار سے متعلق ہے۔ جس کی کچھ تفصیل آئندہ سطور میں رقم ہوگی۔

مشہور یہ ہے کہ ''وہ زبردست فلسفی اور اپنے دور میں معقولات کے یکتائے روزگار شناور تھے۔'' لیکن فلسفیوں کو عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ وہ اہل یونان کے فضلات اور ارسطو ابن سینا کے رشحات سے کسی باب میں انحراف نہیں کر سکتے۔ وہ یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کرتے کہ فلسفہ کہاں تک قابل قبول ہے اور کہاں ہفوات وفضول، اور کہاں محض الحاد وزندقہ اور ناقابل قبول۔ وہ اہل یونان کی بنیادیں مضبوط کرنے کی خاطر دفتر کے دفتر سیاہ کرتے چلے جاتے ہیں اور یہ بھی لحاظ نہیں ہوتا کہ خدا ورسول کی بارگاہ میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ اور علم وتحقیق کی اعلیٰ میزان میں اس کا وزن کیا ہوگا۔ فلاسفہ یونان کے قواعد و مزعومات پر اگر کوئی اعتراض نظر آ گیا تو اس کا طویل سے طویل جواب لکھتے چلے جاتے ہیں اور اسے اپنی حیات مستعار کا قیمتی سرمایہ سمجھتے ہیں، گویا اسی کے لیے وہ پیدا ہوئے تھے اور آخرت کے لیے وہی توشہ لے کر جانا ہے۔

لیکن اگر کہیں اسلامی اصولوں پر اعتراض ہوا، خدا کی شان میں بکواس کی گئی، رسول اعظم علیہ صلاۃ بہ الاکرم کی عظمتوں کو نشانہ بنایا گیا، انبیائے کرام کی تنقیص ہوئی، معصوم ملائکہ، مقدس صحابہ اور مبارک اولیا کی اہانت ہوئی تو ان فلسفیوں میں کوئی حرکت نظر نہیں آتی، اسلام کا کلمہ ضرور پڑھتے ہیں مگر نہ ان کی غیرت اسلامی جنبش میں آتی ہے، نہ حمیت دینی کو جوش آتا ہے، نہ فکر علمی وایمانی کا تقاضا انھیں کسی حرکت وعمل پر آمادہ کرتا ہے بلکہ وہ خود اسلامی اصولوں سے جا بجا ٹکراتے اور الجھتے ہیں اور

اس کے لیے ہر جتن کرنے کو تیار رہتے ہیں۔

اس کے برخلاف ہم علامہ فضل حق خیر آبادی کو دیکھتے ہیں کہ جب تقویۃ الایمان نامی کتاب لکھ کر توحید کے نام پر توہین رسالت کا پرفریب دام پھیلایا گیا تو وہ کھل کر میدان میں آئے، مؤلف کتاب کی پرزور مخالفت کی، مجمع عام میں اس کا رد کیا، اور سب کے سامنے اس پر حجت تمام کردی، پھر اس سلسلے میں ’’تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ‘‘ نامی کتاب بھی تصنیف فرمائی جس سے فقہ وکلام اور قرآن وسنت میں علامہ کی وسعت نظر، دقت نگاہ اور جولانی فکر عیاں ہے۔

یہ دین اسلام کی حمایت اور ناموس رسول کی حفاظت میں ان کی غیرت ایمانی، حمیت دینی اور جوش اسلامی کا ایک ایسا دل کش منظر ہے، جو ارسطو وابن سینا کے وفاداروں میں ناپید ہے۔ اسی طرح حب وطن، غیرت قومی، جوش ملی اور سیاست ملکی کے میدان میں انھوں نے جو مجاہدانہ کردار پیش کیا ہے وہ اغیار کے ریزہ خواروں اور اپنی قوم کے بے غیرت غداروں کے یہاں کبھی نظر نہیں آسکتا۔

ان اجمالی اشارات کے بعد اب میں آپ کو خالص علمی ماحول میں لے جانا چاہتا ہوں جہاں آپ دیکھیں گے کہ علامہ نے فلسفہ کو کہاں تک قبول کیا ہے اور کہاں تک اس کی موافقت روا رکھی ہے اور کہاں صراحت سے اس کی تردید فرمائی ہے۔

پہلے یہ ذہن نشین رہے کہ تمام موجودات کے واقعی حالات کی تحقیق کو فلسفہ کا نام دیا گیا ہے۔ اس لیے فلاسفہ نے واجب الوجود تعالی وتقدس کی ذات وصفات اور تمام ممکنات کی تحقیق و تفتیش میں اپنی دماغی توانائیاں صرف کی ہیں۔ وہ فلسفہ کو اولاً دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں نظری اور عملی۔ پھر نظری کو ’’الٰہی، ریاضی، طبعی‘‘ تین شعبوں میں اور عملی کو ’’تہذیب اخلاق، تدبیر منزل، سیاست مدنیہ‘‘ تین قسموں میں تقسیم کرتے ہیں پھر ریاضی کو خاصی وسعت دے کر حساب، ہندسہ، ہیات، موسیقی چار خانوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ انسانی دماغ کی اعلیٰ کاوش ہے جو ہزار ہا سال کی عرق ریزیوں کا نتیجہ ہے اور اس کے بے شمار اصول وقواعد ہیں جن پر موجودہ سائنس آج بھی عمل پیرا ہے، یہ بھی حقیقت ہے کہ فلسفہ کل کا کل قابل انکار نہیں، اس میں بہت سی باتیں اہل حق سے اخذ کر کے بھی شامل کی گئی ہیں اور انھیں عقل واستدلال کا رنگ دے دیا گیا ہے اور بہت سی چیزیں صرف ذہنی وفکری کاوش پر مبنی ہونے کے باوجود بجا و درست ہیں، لیکن بہت سے مزعومات وہ بھی ہیں جو سراسر باطل اور غلط ہیں اور بہت سے وہ ہیں جو غلط ہونے کے ساتھ اسلامی عقائد سے متصادم بھی ہیں۔ خصوصاً الٰہیات کے باب میں فلسفہ کا زیادہ تر حصہ محض باطل وغلط ہے۔ اور فلکیات کا شعبہ بھی کثیر ظلمات پر مشتمل ہے۔ البتہ منطق وریاضی، اخلاق وسیاست کی بنیادی باتیں عموماً بجا و درست ہیں اور شریعت سے متصادم نہیں۔

علامہ فضل حق خیر آبادی نے فلسفہ میں ’’ہدیہ سعیدیہ‘‘ تصنیف کی ہے جس سے فلسفہ میں ان کی مہارت اور ناقدانہ بصیرت کے ساتھ ان کی اسلامی غیرت اور دینی رسوخ بھی عیاں ہے۔ وہ جا بجا صراحۃً واشارۃً یہ بتاتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ جو کچھ بیان ہو رہا ہے وہ فلاسفہ کے مطابق ان کی نظریات کی تقریر وتوضیح ہے، خود اپنا نظریہ کیا ہے اس کا تذکرہ دوسری کتابوں میں ہے۔ لیکن ’’ہدیہ سعیدیہ‘‘ میں بھی بعض مقامات پر اباطیل فلاسفہ پر نقد سے کتاب خالی رکھنا مناسب نہ سمجھا اور چند سطروں میں ان کی خامیوں کی ضروری نشان دہی کردی ہے۔ اس کی تائید کے لیے مناسب ہے کہ اصل کتاب سے چند نظائر وشواہد پیش کردوں

تاکہ اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے، مکمل طور پر روشنی میں آجائے۔ مزید تفصیل کے لیے ایک بار اس نقطۂ نظر سے اصل کتاب کی مراجعت کر لی جائے۔

(1) ماہیتِ جسم کے بیان میں حکما کے مذاہب بتاتے ہوئے مشائیہ کا مذہب بتاتے ہیں کہ ان کے نزدیک جسم ہیولیٰ اور صورت نامی دو جوہروں سے مرکب ہے۔ پھر لکھتے ہیں:

ونحن نريد تقرير مذهبهم وبيانه على حسب مطلبهم في هذا المختصر، وأما تحقيق ما هو الحق فقد أحلناه على كتب أخر (ص:۲۱)

"اس مختصر میں مشائیہ کے مذہب کی تقریر اور ان کے حسب مطلب اس کا بیان ہمارا مقصود ہے، مگر حق کیا ہے اس کی تحقیق دوسری کتابوں کے حوالے ہے۔"

(۲) فن ثانی فلکیات کے خاتمے میں لکھتے ہیں:

فلاسفہ کہتے ہیں کہ افلاک نو ہیں، ایک کواکب سے خالی ہے اس لیے اسے فلک اطلس کہا جاتا ہے وہی فلک الافلاک ہے جس سے سمتوں کی تعیین ہوتی ہے وہ تمام اجسام کو محیط ہے۔ اس کے نیچے علی الترتیب فلک ثوابت، فلک مشتری، فلک مریخ، فلک شمس، فلک زہرہ، فلک عطارد، اور فلک قمر ہیں۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے محسوس کیا کہ تمام ستارے یومیہ حرکت سے مشرق سے مغرب کی جانب حرکت کرتے ہیں، اس لیے ان کے لیے ایک ایسا فلک ماننا جو تمام افلاک اور ستاروں کو محیط ہے جس کی اصلی حرکت کے تابع ہو کر دوسرے تمام افلاک اور ستارے بالواسطہ و بالعرض حرکت کرتے ہیں، یہی فلک اعظم ہے جس سے سمتوں کی تحدید اور تعیین ہوتی ہے۔ پھر محسوس کیا کہ کچھ ایسے ستارے بھی ہیں جو نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور ثوابت کہے جاتے ہیں مگر وہ بھی بڑی سست رفتاری سے مغرب سے مشرق کی جانب حرکت کرتے ہیں اس لیے ایک فلک ان ثوابت کے لیے بھی مانا، یوں ہی ساتوں سیاروں کو دیکھا کہ یہ مختلف حرکتوں سے حرکت کرتے ہیں اس لیے ہر سیارہ کے لیے ایک ایک فلک مان لیا، اس طرح ان کا زعم یہ ہے کہ افلاک نو ہیں۔ انھوں نے فلک اعظم سے متعلق جو احکام مانے ہیں مثلاً بسیط ہونا، کروی ہونا، اس کے لیے حرکت اینی اور خرق والتئام (پھٹنا جڑنا) محال ہوتا اور اس کے علاوہ بہت سی باتیں جو ماسبق میں تفصیلاً بیان ہوئیں۔ وہ سب احکام دیگر افلاک کے لیے بھی ٹھہرائے ہیں اور جتنی ساری انکل پچو باتیں اور اوہام وخیالات ان کے نفس نے انھیں سوجھائے سب پر یقین کے بیٹھے ہیں۔ انھیں یہ پتہ نہیں کہ اگر ان کی دلیل مان لی جائے اور اعتراض وخلل سے سلامت رہ جائے تو بھی وہ زیادہ سے زیادہ فلک اعلی کی سطح بالا میں راست آسکتی ہے اس کے علاوہ کسی اور فلک کی سطح یا جسم میں وہ دلیل جاری نہیں ہوسکتی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس مقام پر ان کے جتنے مزعومات ہیں محض انکل پچو ہیں اور یہ بڑی لاعلاج بیماری ہے۔" (ص:۷۵)

(۳) ظاہری حواس پانچ ہیں۔ لامسہ، ذائقہ، شامہ، سامعہ، باصرہ: شیخ بوعلی سینا نے شفا میں کہا کہ سامعہ اور باصرہ کو مناسب نامناسب چیز کو سننے دیکھنے سے کوئی لطف والم نہیں حاصل ہوتا،

بلکہ جو بھی لذت وکلفت ہوتی ہے وہ نفس کو ہوتی ہے۔ اور لامسہ، ذائقہ، شامہ کو خود بھی لذت والم کا حصول ہوتا ہے۔ شیخ کے اس قول پر متعدد اعتراضات ہوئے، جن کے جواب میں امام رازی نے شیخ کا دفاع کرتے ہوئے چند باتیں پیش کیں۔ مگر علامہ خیر آبادی نے وہ سب ذکر کرنے کے بعد لکھا:

یہ کلام بڑی متانت کا حامل ہے مگر اس سے اس اشکال کا حل نہیں نکلتا کہ کیا وجہ ہے کہ لامسہ، ذائقہ اور شامہ تو اپنے محسوسات سے متاثر ہوتے ہیں اور سامعہ، باصرہ متاثر نہیں ہوتے؟

آگے یہ فرماتے ہیں کہ

لذت والم اگر مناسب و نامناسب کے ادراک کا نام ہے تو ظاہر ہے کہ ادراک نفس کا کام ہے اور لذت والم اگر حواس میں حاصل ہونے والی مناسب و نامناسب صورت کا نام ہے تو یہ بات دیگر حواس کی طرح باصرہ وسامعہ میں بھی ہوتی ہے۔ اس لیے یا تو یہ کہیں کہ پانچویں حواس کے احساسات سے لذت والم صرف نفس کو ہوتا ہے، یا یہ کہیں کہ لامسہ، ذائقہ، شامہ کی طرح سامعہ، باصرہ کو بھی لذت والم کا حصول ہوتا ہے۔ ان کے درمیان فرق کی کوئی وجہ نہیں۔

آخر میں فرماتے ہیں کہ:

بہر حال شیخ نے ان حواس کے لذت والم سے متعلق جو جداگانہ حکم لگایا ہے وہ ایسا غلط ہے جسے فطرت سلیمہ قبول نہیں کرسکتی ولم نخلق لأن نؤمن بما فی دفتی الشفاء اور ہم اس لیے پیدا نہ ہوئے کہ شفا کے اوراق میں جو کچھ رقم ہو گیا اس پر ایمان لائیں۔“ (ص: ۱۶۱ تا ۱۲۶ ملخصا)

اس سے فلسفہ میں علامہ خیر آبادی کی ناقدانہ بصیرت عیاں ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ فلاسفہ کی عام باتیں بھی ان کے نزدیک اس وقت قابل قبول ہوں گی جب وہ عقل واستدلال کی میزان پر پوری اتریں، ورنہ انھیں بے دریغ رد کردینا ان کی بے جا تاویلات کے مقابل زیادہ دانش مندانہ عمل ہوگا۔

(۴) فصل فی کائنات الجو کے آخر میں لکھتے ہیں:

أعلم أن تكون هذه الآثار بل سائر الكائنات والأشياء إنما هو بتقدير قدير فعال يخلق ما يشاء و حكم حكيم بديع، بديع الإنشاء، في الأرض والسماء، لا يحتاج في تكوين الأشياء إلى مادة ومدة ولا إلى معد وعدة، لكن حكمته الكاملة ربطت كائنات بأسباب عادية، وقدرته الشاملة كونت مواد عناصر وأعدتها لتكوين أشياء مادية، ورتبت عليها مصالح و غايات، وجعلتها على عظمته وحكمته أدلة و آيات، فخلق الله سبحانه بسائط، وركب منها أبخرة وأدخنة، وجعلها مواد وأسبابا، وقدر منها مطراً وماء وسحابا، وأخرج حيا ونباتا، وقدر لكل منها فصولا و أوقاتا، وجعلها أرزاقا وأقواتا، فتبارك الله أحسن الخالقين."

معلوم رہے کہ ان آثار کا وجود، بلکہ دیگر تمام اشیا اور کائنات کا وجود ایک قدرت والے کی تقدیر اور حکم سے ہوتا ہے، وہ جو چاہتا ہے تخلیق فرماتا اور بناتا ہے، وہ حکمت والا، از سر نو ایجاد فرمانے والا، زمین وآسمان میں انوکھی ایجاد والا ہے، وہ اشیا کو وجود بخشنے میں کسی مادہ ومدت، اور کسی ذریعہ وسامان کا محتاج نہیں۔ مگر اس کی حکمت کاملہ نے کچھ وجود پانے والی چیزوں کو کچھ

اسباب عادیہ سے مربوط کردیا ہے اور اس کی ہمہ گیر قدرت نے عناصر کے مادے پیدا کر کے انھیں کچھ مادی چیزوں کے بنانے کے لیے تیار کردیا ہے اور اس پر بہت سے مصالح ومقاصد مرتب فرمائے ہیں۔ اور ان سب کو اپنی عظمت اور حکمت کے لیے دلیل ونشان بنادیا ہے۔ تو اللہ سبحانہ وتعالی نے بسائط کی تخلیق فرمائی، ان سے کچھ بخارات ودخانات ترکیب دیے۔ پھر انھیں مادہ و سبب بنا کر ان سے بارش، پانی اور ابر کو وجود بخشا، اور ان سے اناج اور پودے اگائے اور ہر ایک کے لیے موسم اور وقت مقرر کردیا، اور ان کو رزق اور خوراک بنادیا۔ تو بڑی برکت والا ہے اللہ جس کی تخلیق سب سے بہتر ہے۔''

یہ خالص اسلامی نظریہ اور ایمانی نظر ہے جو اسباب و مسببات کے تعلقات میں الجھ کر رک نہیں جاتی، بلکہ سبب الاسباب تک پہنچتی ہے اور یہ دیکھتی ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے دراصل اس کی تقدیر وتخلیق سے ہو رہا ہے اور اسباب میں جو کچھ صلاحیت واستعداد جلوہ نما ہے وہ سب اس کا فیضان، اس کی عطاء اور اس کی بخشش ہے۔ جب کہ خالص فلسفی کا دماغ ''مادہ وعناصر اور اسباب ظاہر کی بھول بھلیاں'' سے بھی باہر نہیں نکلتا۔

(۵) فلاسفہ نباتات کے لیے بے شعور نفس مانتے ہیں جس سے آلات وقویٰ کے ذریعہ مختلف کام انجام پاتے ہیں۔ اور نفس نباتی کے لیے حسب ذیل قوتیں ثابت کرتے ہیں۔

(۱) جاذبہ (۲) ماسکہ (۳) ہاضمہ (۴) دافعہ (۵) غاذیہ
(۶) نامیہ (۷) مولدہ (۸) مصورہ۔

''ہدیہ سعیدیہ'' میں ہر ایک کی تعریف وتوضیح اور اس سے متعلق کام رقم کرنے کے بعد ان قویٰ کے ماننے پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں وہ تحریر کیے ہیں۔ ان کا کچھ اقتباس درج ذیل ہے:

(1) غور کریں تو نباتات میں بڑی دلکش، عمدہ اور حسین وجمیل ترتیب وتقدیر پائی جاتی ہے جس میں عقل وفہم حیرت زدہ ہے۔ اس میں جو منافع ومصالح ودیعت ہیں ان کے ادراک میں ذہن و دماغ سرگرداں ہے، اس کے ابتدائی اصول سمجھنے سے فکر ونظر درماندہ ہے، انتہاء غایت تک رسائی سے عاجزی کے باوجود انسان کی خلقت وایجاد میں ودیعت کردہ جن منافع اور حکمتوں کا حکما کی ضعیف وکمزور عقل وفہم استخراج کر سکی ہے ان کی تعداد پانچ ہزار ہے، جو علم تشریح میں مذکور ہے۔ جب کہ اب تک جو کچھ دریافت ہوا ہے وہ نامعلوم اسرار کی بہ نسبت کم تر ہے۔

تو جسے ذرا بھی دانش وبینش کا حصہ ملا ہے وہ ایک بے شعور قوت سے ایسی صورت گری صادر ہونے کا کیسے قائل ہو سکتا ہے جو بڑی انوکھی اور دقیق حکمتوں، دلکش عظیم مصلحتوں اور خوش نما حیرت انگیز دیدہ زیب صورتوں اور شکلوں وغیرہا پر مشتمل ہے۔ اگر چہ یہی مان لیا جائے کہ وہ قوت بسیط نہیں بلکہ مرکب ہے۔ اور مادے مختلف استعداد اور صلاحیتوں کے حامل ہیں۔

(ب) بے شعور نبات کے اندر ہونے والے حیرت انگیز، دل کش اور محکم افعال کو مذکورہ قویٰ کی جانب منسوب کرنا بہت بڑی حماقت ہے۔ اس طرح یہ ماننا کہ بدن اور اس کے اجزا واعضا کو بنانا نفس حیوانی یا نفس انسانی یا اس کی کسی قوت کا فعل ہے، یہ بھی کھلی ہوئی جہالت اور گمراہی ہے۔ نفس کی قوت کا فعل تو اس لیے نہیں ہو سکتا کہ وہ بے شعور ہے اور اس سے ان محکم حکمتوں کا صادر ہونا محال ہے اور خود نفس کا فعل اس لیے نہیں ہو سکتا کہ فلسفہ کے نزدیک وہ بدن کے پیدا ہونے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نفس انسانی اپنے علوم کے کامل ہونے اور اپنے ادراک کی آخری حد تک پہنچ جانے کے بعد بھی اعضا کی کیفیت، ان کی مقداروں، ان کے حالات وحرکات،

غذا طلبی، صحت و بیماری وغیرہ کی کیفیات اور ان کے اجزاء عوارض سے آشنا نہیں ہوتا، اگر کچھ جانتا ہے تو علم تشریح وغیرہ کی مہارت کے بعد، بہت قلیل مقدار میں جانتا ہے، وہ بھی محض ظن و تخمین کے طور پر ہوتا ہے، جزم و یقین کا حصول نہیں ہوتا۔ پھر یہ کیسے خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ نفس اپنے وجود پذیر ہونے کی ابتدا میں اتنی ساری تفصیلات سے آشنا ہے کہ ان اعضائے بدن سے متعلق تمام مصالح اور حکمتوں کی رعایت کر لیتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ جب نفس کی قوت پورے کمال کو پہنچ جاتی ہے اس وقت بھی وہ بدن کی کسی صفت کو وجود بخشنے پر قدرت نہیں رکھتا، پھر اپنے وجود کے آغاز اور شدت ضعف کے عالم میں ان بدیع صفات کے بنانے پر کیسے قادر ہو سکتا ہے؟ تو لا محالہ یہ ماننا ہوگا کہ بدن کو تخلیق کرنے، بنانے اور اس میں عظیم حکمتیں ودیعت فرمانے کا کام ایک عالم خبیر، حکیم قدیر کا ہے، جس نے پیدا کیا تو بہت عمدہ بنایا اور جیسے چاہا حکمتیں ودیعت فرمائیں، وہی ہے جو رحم میں اپنی مشیت کے مطابق صورتیں بناتا ہے۔

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بدن و اجزائے بدن میں جاذبیت اور پکانے پختہ کرنے والی حرارت، مدافعت وغیرہ صفات نہ ہوں، اس لیے کہ یہ ساری چیزیں اسی حکیم خلاق، قدیر، مختار علی الاطلاق نے بدن میں پیدا کر دی اور ودیعت فرما دی ہیں۔ ساری علوی و سفلی مخلوقات میں اس کے سوا اور کسی کی تاثیر حقیقت میں نہیں۔ اگر چہ بطور عادت بعض اشیا بعض کے لیے سبب ہوتی ہیں چوں کہ خالق کائنات کی جانب سے عادت اور دستور یوں ہی جاری ہے، جس میں بہت سی مصلحتیں اور حکمتیں کار فرما ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ فعال قدیر اپنے بندوں میں سے جن کو عظیم سعادتوں سے سرفراز فرماتا ہے ان کی کرامت اور اعزاز کے طور پر عادۃً تخلیق پانے والی چیزوں سے زیادہ بدیع اور انوکھی چیز پیدا فرما دیتا ہے۔ هذا هو التحقيق، وهو سبحانه ولي العصمة والتوفيق۔

(ص: ۱۲۳ تا ۱۳۹ ملخصا)

اس طرح کی بہت سی مثالیں خود ”ہدیہ سعدیہ“ میں موجود ہیں جن میں علامہ نے صراحۃً اسلامی موقف کی ترجمانی فرمائی ہے۔ اور فلاسفہ کے باطل نظریات سے بیزاری ظاہر کی ہے۔ اور اشارۃً ”عندہم“ وغیرہ الفاظ کے ذریعہ ان کے غلط خیالات سے اپنی براءت تو بہت سے ایسے مقامات پر بھی کرتے گئے ہیں جہاں خود فلاسفہ کے نظریات اور ان کے دلائل کا بیان ہو رہا ہے۔ اس طرز نگارش سے ثابت ہوتا ہے کہ علامہ کو فلسفہ میں انہماک نہ تھا اور نہ فلسفہ پر ان کا ایمان تھا، وہ اسلام کو پختہ دلائل اور قوی براہین کی روشنی میں حق مانتے تھے اور اس سے متصادم ہر نظریہ کو تار عنکبوت کی طرح تار تار کرنے کی عظیم صلاحیت کے حامل تھے۔ اس لیے میں انھیں ایک فلسفی کہنے کے بجائے زبردست اسلامی ترجمان عظیم متکلم، پر جوش داعی، درد مند ہادی، اور ملکی سیاست کے باب میں غیرت مند مجاہد اور دور اندیش رہنما کہنا پسند کرتا ہوں۔ بلاشبہہ یہی ان کے شایان شان ہے اور یہی حقیقت کے مطابق بھی ہے۔

علامہ کی دیگر تصنیفات مثلاً ”حاشیہ قاضی مبارک“ سے بھی رد فلسفہ اور تائید اسلام کی مثالیں پیش کرنے کا ارادہ تھا مگر طول مضمون اور قارئین کے ملال خاطر کے خیال سے چھوڑ دیا، توفیق ملی تو آئندہ کبھی ان گلستانوں کی سیر کی جائے گی۔ واللہ الموفق وھو خیر معین۔

□□□

عہد صحابہ و تابعین میں جمع حدیث: تحقیقی مطالعہ

مولانا محمد رضوان قادری جامعی مصباحی
استاذ مدرسہ نثار العلوم شہزاد پورا کبر پورا مبیڈکر نگر یوپی

اسلام کے بنیادی ماخذ اور سرچشمے دو ہیں: ا۔ قرآن مقدس ۲ ۔حدیث شریف اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ "اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ خاص حدیث رسول کی تشریعی حیثیت بیان فرماتے ہوئے اللہ عز وجل ارشاد فرماتا ہے وَمَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا' اور جو رسول تمھیں عطا فرمائیں وہ لو اور جس سے منع فرمائیں باز رہو۔ (سورہ حشر آیت ۷) ایک اور مقام پر نبی امی فداہ ابی وامی کے اوصاف ذکر کرتے ہوئے اللہ رب العزت فرماتا ہے "وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىٕثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ "(وہ نبی) ستھری چیزیں ان کے لیے حلال فرمائے گا، اور گندی چیزیں ان پر حرام کرے گا، اور ان پر سے وہ بوجھ اور گلے کے پھندے جو ان پر تھے اتارے گا۔ (سورہ اعراف، آیت ۱۵۷)

معلوم ہوا کہ جس طرح قرآن مجید احکام شریعت کے لیے ایک دلیل اور واجب الاطاعت ہے، ویسے ہی رسول گرامی وقار ﷺ کی حدیث پاک بھی ایک دلیل شریعت اور واجب الاتباع ہے۔ نیز یہ کہ حدیث رسول کی ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ قرآن پاک کی تفسیر اور اس کا بیان ہے۔ فرمان خداوندی ہے "وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ" اور اے محبوب ہم نے تمھاری طرف یہ یادگار اتاری کہ تم لوگوں سے بیان کر دو جو ان کی طرف اترا (سورہ نحل، آیت ۴۴) تو قرآن پر عمل میں بھی ہم حدیث شریف کے محتاج ہیں۔

چونکہ دین اسلام قیامت تک باقی رہنے والا دین ہے، اس لیے اللہ رب العزت نے اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" بے شک ہم نے اتارا ہے یہ قرآن اور بے شک ہم خود اس کے نگہبان ہیں۔ (سورہ حجر آیت ۹)

اور اس کی حفاظت کا ظاہری انتظام یہ فرمایا کہ پیغمبر اسلام نبی رحمت ﷺ کی صحبت اور نصرت و اعانت کے لیے ایسے بہترین و فاشعار، جاں نثار، پیکر اخلاص وایثار، پرہیز گار، سچے اور اچھے لوگوں کا انتخاب فرمایا جو ایک طرف حفظ وضبط میں اپنا جواب نہیں رکھتے تو دوسری طرف اپنے پیارے نبی ﷺ سے حاصل ہونے والی ایک ایک بات کو حرز جاں بنانے کے شوق اور جذبہ میں بے مثل و بے نظیر ہیں۔ قرآن مجید کی جو آیات ان تک پہنچتیں انھیں تو اپنے سینوں میں محفوظ کرتے ہی، ساتھ ہی اپنے پیارے آقا علیہ التحیۃ والثناء کے اقوال شریفہ اور آپ کی پیاری اداؤں کو بھی اپنے خانۂ دل میں اتارنے کی پوری کوشش کرتے۔

حفاظت حدیث کا اہتمام:

حدیث رسول ﷺ کی دین اسلام کے لیے مستقل مصدر و منبع ہونے کی حیثیت کے پیش نظر خود رسول اکرم ﷺ نے اپنی حدیثوں کو یاد کرنے کی ترغیب اور ان کی تبلیغ و اشاعت کی تلقین فرمائی۔ فرمان

رسالت ہے۔ "نضر الله عبدا سمع مقالتي فحفظها و وعاها واداها، فرب حامل فقه غير فقيه، ورب حامل فقه إلى من هو افقه منه" "اللہ تعالیٰ اس بندہ کو شاد آباد رکھے جس نے میرا کلام سن کر محفوظ کیا اور اس کی نگہداشت کی اور اسے آگے پہنچایا، پس بہت سے فقہ اٹھانے والے خود غیر فقیہ ہیں، اور بہت اپنے سے بڑے فقیہ تک فقہ اٹھاتے ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے۔ "نَضَّرَ اللّٰہُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا فَبَلَّغَهُ كَمَا سَمِعَهُ، فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعَى لَهُ مِنْ سَامِعٍ" 'اللہ تعالیٰ اسے ہرا بھرا رکھے جو ہم سے کچھ سنے پھر جیسا سنے ویسا ہی پہنچا دے، کیونکہ بہت سے پہنچائے ہوئے سننے والے سے زیادہ سمجھ دار ہوتے ہیں۔

(مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی وابن ماجہ کتاب العلم)

خطبۂ حجۃ الوداع میں بار بار سرکار ابد قرار ﷺ نے اپنا پیغام آگے پہنچانے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: "فلیبلغ الشاهد الغائب" کہ جو حاضر ہے وہ ان کو پہنچائے جو حاضر نہیں ہیں۔ ایک ایک بات آگے پہنچانے کا حکم کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: "بلغوا عني ولو آية" مجھ سے پہنچاؤ، اگر چہ ایک آیت ہو۔ اس حدیث کی شرح میں حضرت ملا علی قاری علیہ رحمۃ الباری فرماتے ہیں:

"اى انقلوا إلى الناس و أفيدوهم ما امكنكم او ما استطعتم مما سمعتموه مني و ما أخذتموه عني من قول أو فعل أو تقرير بواسطة أو بغير واسطة" "یعنی تم مجھ سے جو قول یا فعل یا تقریر بلا واسطہ یا بالواسطہ لو اور سنو، وہ بقدر امکان و استطاعت لوگوں تک پہنچاؤ اور اس کا ان کو افادہ کرو۔ (مرقاۃ جلد ا صفحہ ۲۶۴)

اس نبوی ترغیب و تلقین اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اپنے محبوب آقا ﷺ سے بے پناہ وارفتگی اور ان کے جذبۂ اتباع سنت کا اثر یہ تھا کہ وہ پیارے آقا ﷺ کی ایک ایک بات سننے، سمجھنے اور محفوظ رکھنے کی سعی بلیغ فرماتے۔ حدیث کی کتابوں میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی مجلس رسول ﷺ میں حاضری کی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ وہ ایسے ساکت و جامد ہو کر بیٹھتے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ اس طرح خاموش بیٹھ کر اس لئے سنتے تا کہ کچھ سننے سے نہ رہ جائے، پھر اگر کسی وجہ سے کچھ سننے یا سمجھنے سے رہ جاتا تو اسے دوبارہ سننے کے لیے باادب بارگاہ رسالت میں عرض کرتے "راعنا یا رسول اللہ" یعنی اے اللہ کے رسول ہمارا لحاظ فرمائیں، ہمارے لیے پھر ارشاد فرمادیں۔

لیکن چونکہ کلمۂ راعنا میں یہودیوں کو حضور ﷺ کی بے ادبی کا موقع ملتا تھا اس لیے اللہ رب العزت نے راعنا کہنے سے منع فرما کر اس کی جگہ انظرنا کہنے کا حکم فرمایا۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۰۴ میں ہے "يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ" اے ایمان والو! راعنا نہ کہو اور یوں عرض کرو کہ حضور ہم پر نظر رکھیں، اور پہلے ہی سے بغور سنو، اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (ترجمہ کنز الایمان)

صحابۂ کرام کا حضور پر نور ﷺ کی حدیثیں محفوظ کرنے کا انداز تو بالکل نرالا تھا۔ خادم رسول اللہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم لوگ حضور ﷺ کی زبان مبارک سے حدیثیں سنتے رہتے تھے، جب آپ مجلس سے اٹھ جاتے تو ہم آپس میں حدیثوں کا دور کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک آدمی حدیثیں بیان کر جاتا پھر دوسرا پھر تیسرا، بسا اوقات ساٹھ ساٹھ آدمی مجلس میں ہوتے تھے اور وہ ساٹھوں باری باری سے بیان کرتے تھے، اسکے بعد جب ہم اُٹھتے تھے تو حدیثیں اس طرح ذہن نشین ہوتی تھیں کہ گویا ہمارے دلوں میں بو دی گئی ہوں۔

(محدثین عظام بحوالہ مجمع الزوائد)

جمع حدیث عہد رسالت اور صحابہ میں:

زمانۂ رسالت میں صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم جمع حدیث کے سلسلہ میں عمومی طور سے اپنے محیر العقول حافظہ سے کام لیتے تھے، کیونکہ اللہ رب العزت نے عربوں کو ایسا قوی حافظہ عطا فرمایا تھا کہ بڑے بڑے قصیدے ایک بار سن کر ہی یاد کر لیتے، پھر ایمان کی دولت، رسول اکرم ﷺ سے عشق و محبت اور حدیث پاک کی اہمیت کے احساس نے اسے اور مضبوط کر دیا تھا، اس

طرح صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حدیثوں کو اپنے حافظہ کی مدد سے اپنے سینوں میں جمع فرماتے، پھر ان پر عمل اور آپسی مذاکرہ وغیرہ کے ذریعہ ان کی بقا کا انتظام کرتے۔ اور مکمل حزم و احتیاط کے ساتھ آگے پہنچاتے، اس اعتبار سے تقریباً سبھی صحابۂ کرام احادیث کریمہ کے جامع ہیں۔ فن رجال کے مشہور امام علی بن ابی زرعہ کے مطابق ایسے صحابہ کرام کی تعداد جنھوں نے حضور ﷺ سے سماعت کر کے کچھ روایت کیا، ایک لاکھ سے زائد ہے۔

ان میں ایک اچھی تعداد ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ہے جنہوں نے احادیث رسول کو اپنے سینوں میں جمع کرنے کے بعد ان کی روایت و اشاعت میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ ''مشاہیر حدیث'' میں ڈاکٹر عاصم اعظمی صاحب نے ایسے ۵۴ ر صحابۂ کرام اور ان کے مختصر حالات کا ذکر کیا ہے جن میں حضرات خلفائے راشدین کے علاوہ حضرت عبد اللہ ابن مسعود اور امہات المؤمنین میں حضرت عائشہ، حضرت ام سلمہ، حضرت حفصہ اور حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہم و عنہن کے تذکرے شامل ہیں۔

ہاں ان میں کچھ حضرات ایسے بھی تھے جو عہد رسالت ہی میں یاد کرنے کے علاوہ اپنے پاس لکھ کر بھی جمع حدیث کا فریضہ انجام دے رہے تھے، اور بعض حضرات نے رحلت مصطفی علیہ التحیۃ والثناء کے بعد یہ کام انجام دیا۔ اب ہم ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مختصر تذکرہ پیش کرتے ہیں جنھوں نے لکھ کر جمع حدیث کا فریضہ انجام دے کر امت پر عظیم احسان فرمایا۔

۱۔ حضرت سیدنا مولائے کائنات علی مرتضی کرم اللہ وجہہ الکریم:

اسم گرامی علی، کنیت ابو تراب، ابو الحسن، لقب حیدر کرار، اسد اللہ، فاتح خیبر، مرتضیٰ، والد کا نام ابو طالب اور والدہ کا نام فاطمہ ہے رضی اللہ عنہا۔ رشتہ میں رسول اللہ ﷺ کے عم زاد اور داماد ہیں، ابو طالب کی معاشی تنگی کے سبب بچپن سے رسول اکرم ﷺ کی کفالت میں رہے، بعثت نبوی کے بعد ہی آٹھ یا دس سال کی عمر میں اسلام قبول کر کے اول السابقین کے زمرہ میں شامل ہوئے۔ نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے اپنے حضرت علی سے تعلق کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''انت منی بمنزلة هارون من موسی الا أنه لا نبی بعدی'' تم میرے لیے ویسے ہی ہو جیسے موسیٰ کے لیے ہارون تھے مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ (متفق علیہ مشکوۃ)

بدر سے لے کر اخیر تک تمام اسلامی غزوات میں شریک ہو کر ہمیشہ شجاعت و بہادری کے جوہر دکھائے اور اسد اللہ کے ممتاز لقب سے سرفراز ہوئے، اور جنگ خیبر میں ناقابل تسخیر قلعہ آپ ہی کے ہاتھوں فتح ہوا، اس لیے خیبر شکن اور فاتح خیبر کہلائے۔

آپ کے فضائل و مناقب کے حوالہ سے امام اہل سنت اعلی حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ والرضوان فرماتے ہیں ''علی الخصوص شمع شبستان ولایت، بہار چمنستان معرفت، امام الواصلین سید العارفین، خاتم خلافت نبوت، فاتح سلاسل طریقت، مولی المسلمین، امیر المومنین، ابو الائمۃ الطاہرین، طاہر مطہر، قاسم کوثر، اسد اللہ الغالب، مظہر العجائب والغرائب، مطلوب کل طالب، سیدنا و مولانا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الکریم و حشرنا فی زمرتہ فی یوم عقیم کہ اس جناب گردوں قباب کے مناقب جلیلہ و محامد جمیلہ جس کثرت و شہرت کے ساتھ ہیں دوسرے کے نہیں''

(اعتقاد الاحباب صفحہ ۱۰۶ تا ۱۰۸، مطبوعہ دعوت اسلامی)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کاتب وحی اور مکمل حافظ قرآن ہونے کے علاوہ قرآنی علوم اور اسرار و رموز کے ایسے بحر بیکراں تھے کہ آپ فرماتے ہیں کہ اگر میں چاہوں تو سورہ فاتحہ کی ایسی تفسیر لکھ دوں کہ ۷۰ ر اونٹوں کا بوجھ بن جائے اور کیوں نہ ہو کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں:

(مرقاۃ شرح مشکوۃ جلد ۱ ر صفحہ ۱۴)

آپ احادیث رسول ﷺ کے بڑے حاملین میں سے ہیں، کتب حدیث میں آپ سے ۵۸۶ ر حدیثیں مروی ہیں۔ آپ نے حفظ احادیث کے علاوہ ان کو لکھنے کا کام بھی کیا۔ آپ کے پاس ایک صحیفہ تھا، جس میں دیت، قصاص اور مسلمانوں کے باہمی حقوق کے بارے میں

حدیثیں تھیں صحیح بخاری میں ہے

"عن ابی جحیفة قال: قلت لعلی رضی اللہ عنه هل عندکم کتاب، قال: لا الا کتاب اللہ او فهم اعطیہ رجل مسلم او ما في هذه الصحیفة"

'ابوجحیفہ سے مروی ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی سے عرض کی: کیا آپ کے پاس کوئی کتاب ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں سوا اے اللہ کی کتاب کے یا اس فہم کے جو ایک مسلمان کو عطا کی جائے یا جو اس صحیفہ میں ہے۔ (جلد اول صفحہ ۲۱/کتاب العلم)

فقہ واجتہاد اور فیصلوں میں صحابہ کرام کے درمیان آپ کا مقام بہت بلند اور ممتاز تھا، تربیت نبوی کی برکت سے آپ اخلاق نبوی کے نمونہ تھے، جملہ مکارم اخلاق اور محاسن فضائل آپ میں ایسے جمع ہو گئے تھے کہ کہیں اور نظر نہیں آتے۔

حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالی عنہ کی شہادت کے بعد آپ نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالی تقریباً ۵ رسالہ عہد خلافت عدل وانصاف اور حقوق اسلام کی پاسداری سے معمور رہا۔

۱۷ ررمضان المبارک ۴۰ھ کی صبح حضرت علی رضی اللہ عنہ حسب معمول فجر کی نماز کے لیے جامع مسجد کوفہ میں تشریف لائے، ابن ملجم خارجی نے آپ کے سر پر تلوار ماری، گہرا زخم لگا، گھر لائے گئے اور چار روز بعد ۲۱ ررمضان المبارک کو بروز جمعہ وصال فرمایا۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما:

اسم گرامی عبداللہ، کنیت ابومحمد ابونصیر اور ابوعبدالرحمن، والد کا نام عمرو بن عاص بن وائل القرشی اور والدہ کا کانام رائطہ بنت منبہ بن حجاج بن عامر بن حذیفہ السہمیہ ہے۔ آپ ان خوش نصیب اصحاب رسول میں ہیں جو قبول اسلام میں اپنے والد پر سبقت لے گئے۔ اس وقت عمر ۱۲ رسال تھی۔ قبول اسلام کے بعد آپ کا محبوب مشغلہ اکثر اوقات بارگاہ رسالت میں حاضر رہنا، حدیثیں سننا اور انھیں قلم بند کرنا تھا۔ آپ اپنی کتابت حدیث کی بارگاہ رسالت سے اجازت کا واقعہ بیان کرتے ہیں:

میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی حدیث روایت کروں اس لیے ارادہ ہے کہ اپنے قلب کی یاد داشت میں اپنے ہاتھ (تحریر) سے بھی مدد لوں، اگر مناسب خیال فرمائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر میری حدیث ہے تو تم اپنے قلب کے ساتھ ہاتھ سے بھی مدد لے سکتے ہو یعنی لکھ سکتے ہو۔ (مشاہیر حدیث بحوالہ دارمی)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اپنے حدیثیں لکھنے کا طریقہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "میں حفظ کرنے کے ارادہ سے جو کچھ رسول اللہ ﷺ سے سنتا اسے لکھ لیتا، قریش نے مجھے منع کیا اور کہا کیا تم حضور سے جو بھی سنتے ہو لکھ لیتے ہو حالانکہ حضور بشر ہیں، خوشی اور غصہ دونوں حالت میں تکلم فرماتے ہیں۔ تو میں لکھنے سے رک گیا، پھر حضور سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ نے اپنی انگلیوں سے اپنے دہن مبارک کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: تم لکھا کرو، قسم اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اس سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

(ابوداؤد، کتاب العلم جلد ۲ رصفحہ ۵۱۴)

یہی وجہ ہے کہ آپ کے پاس حدیثیں صحابہ میں سب سے زیادہ تھیں، جس کا اعتراف صحابہ میں سب سے زیادہ حدیثیں روایت کرنے والے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ما من اصحاب النبی ﷺ احدا اکثر حدیثا عنہ منی الا ما کان من عبداللہ بن عمرو فانہ یکتب ولا اکتب"

اصحاب رسول ﷺ میں کوئی شخص مجھ سے زیادہ احادیث رسول کا حامل نہ تھا سوائے عبداللہ بن عمرو کے، کیونکہ وہ لکھ لیتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔ (بخاری کتاب العلم صفحہ ۲۲)

جس صحیفہ میں آپ حدیثیں لکھتے تھے اس کا نام آپ نے "الصادقہ" رکھا تھا۔ یہ صحیفہ آپ کو بہت عزیز تھا، کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے تھے، کئی پشتوں تک آپ کے خاندان میں محفوظ رہا۔ حدیث کی کتابوں میں "عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ" کی سند سے جو حدیثیں مروی ہیں، وہ اسی الصادقہ کی مرویات ہیں۔

کتب حدیث میں آپ کی مرویات سات سو ہیں، جن میں سے ۱۷ حدیثیں متفق علیہ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو کے معمولات میں خدمت حدیث کے علاوہ عبادت و ریاضت اور بکثرت ذکر الٰہی شامل ہیں، تلاوت قرآن کا ایسا شوق تھا کہ ہر تیسرے روز قرآن ختم فرمالیتے، عربی زبان کے علاوہ عبرانی زبان میں بھی آپ کو مہارت تھی۔ آپ کا وصال ۶۵ھ میں بمقام مصر ہوا۔

۳۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ:

اسم گرامی انس، کنیت ابوحمزہ، لقب خادم رسول اللہ، نسبی تعلق انصار مدینہ کے ایک معزز قبیلہ نجار سے تھا، والد کا نام مالک اور والدہ کا نام ام سلیم بنت ملحان انصاریہ تھا۔ آپ کی ولادت ہجرت نبوی سے دس سال قبل مدینہ منورہ میں ہوئی آٹھ، نو سال کی عمر تھی کہ والدہ مشرف باسلام ہوگئیں۔ والد کو یہ بات سخت ناگوار گزری، اور وہ شام چلے گئے اور وہیں انتقال کیا، ماں نے دوسرا عقد حضرت ابوطلحہ سے کرلیا اور انس کو بھی حضرت ابوطلحہ کے گھر لائیں۔ جہاں آپ کی پرورش ہوئی۔ ایک دن سوتیلے باپ حضرت ابوطلحہ اس دریتیم کو لے کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے۔ عرض کی: انس کو اپنی غلامی میں قبول فرمائیں۔ رحمت عالم ﷺ نے منظور فرمایا اور خوش نصیب انس خادمان خاص کے زمرہ میں داخل ہوگئے۔

حضرت ابوطلحہ نے جب بارگاہ نبوت کی خدمت پر ان کو مامور کردیا تو آپ بلاناغہ قبل فجر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوتے اور بعد عصر گھر واپس جاتے، علاوہ ازیں دوسرے اوقات میں بھی خدمت نبوی میں حاضر رہتے۔ اس طرح سفر و حضر، خلوت و جلوت میں حضور کے ساتھ رہتے تھے۔ حکم پردہ سے قبل آپ ازواج مطہرات کے حجروں میں بھی آیا جایا کرتے تھے۔ خدمت نبوی کے باعث بدر، احد، خندق، حدیبیہ، خیبر، فتح مکہ، حنین، حجۃ الوداع جیسے تمام معرکوں اور موقعوں میں رسول گرامی ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کو خدمت نبوی کی حسین دولت کی بنیاد پر قریب سے حضور نبی کریم ﷺ کے احوال و اقوال کا چشم و گوش سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا، دس سال تک سفر و حضر میں حاضر بارگاہ رہ کر اکتساب فیض کیا۔ وصال رسول ﷺ کے بعد اپنی علمی پیاس بجھانے اور شوق علم کی تسکین کے لیے اکابر صحابہ کی خدمتوں میں حاضری دی۔

حدیث نبوی کے ساتھ والہانہ شغف نے حضرت انس بن مالک کو کثیر الروایہ راویان حدیث کی صف اول میں شامل کردیا۔ کتب حدیث میں آپ سے ۲۲۸۶ حدیثیں مروی ہیں، جن میں سے ۲۶۸ متفق علیہ ہیں۔

آپ نے حدیثیں حفظ کرنے کے علاوہ احادیث کا ایک صحیفہ بھی مرتب کیا تھا، جو رسول اللہ ﷺ کو سنا کر اس کی تصدیق بھی کرالی تھی۔ نزہۃ القاری شرح بخاری میں ہے: ”حضرت انس بن مالک حدیث لکھوایا کرتے تھے جب لوگوں کی کثرت ہو گئی تو وہ کتابوں کا صحیفہ لے کر آئے اور لوگوں کے سامنے رکھ کر فرمایا یہ وہ احادیث ہیں جنہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سن کر لکھا ہے اور آپ کو پڑھ کر سنا بھی دیا ہے“ (جلد اول صفحہ ۶۸)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں آپ کو تعلیم دین کے لیے ایک جماعت کے ساتھ بصرہ روانہ کیا اور وہیں آپ نے مستقل اقامت اختیار کرلی اور زندگی کے بقیہ ایام دین کی تعلیم اور حدیث رسول کی اشاعت کرتے ہوئے وہیں بسر کئے اور ایک سو تین سال کی عمر میں اسی شہر میں آپ کی وفات ہوئی۔ بصرہ میں وفات پانے والے آپ سب سے آخری صحابی رسول ہیں۔

۴۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما:

اسم گرامی عبداللہ، کنیت ابوالعاص، والد کا نام عباس اور والدہ کا نام ام الفضل لبابہ تھا۔ آپ رسول اکرم ﷺ کے چچازاد بھائی اور ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے۔ آپ کی ولادت ہجرت سے تین سال قبل شعب ابی طالب میں ہوئی۔ پیدائش کے بعد آپ کو حضرت عباس رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں لے کر آئے تو حضور نے آپ کے منہ میں لعاب دہن ڈال کر دعا فرمائی۔

جب آپ اپنے والد کے ساتھ مدینہ شریف پہنچے تو اس

وقت آپ کی عمر گیارہ سال تھی ۔اکثر و بیشتر بارگاہ نبوی میں میں حاضر رہا کرتے تھے ۔ام المومنین حضرت میمونہ چوں کہ آپ کی خالہ تھیں اور آپ سے حد درجہ انس رکھتی تھی ،بسا اوقات انہیں کے پاس بیٹھتے اور کبھی کبھی رسول اللہ ﷺ کی عبادت شب کی کیفیت دریافت کرنے کے لیے حجرۂ میمونہ میں سو جایا کرتے تھے ۔اس طرح آپ کو شمع نبوت سے اکتساب فیض کا کافی موقع ہاتھ آیا۔

رسول گرامی ﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد ابن عباس اکابر صحابہ کی خدمت میں حاضر ہو کر قرآن و حدیث کی تحصیل فرمایا کرتے تھے ۔طلب علم کا شوق اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ جس کے پاس بھی حضور کی کسی حدیث کا پتہ چلتا اس کے پاس جا کر معلوم کرتے ۔

ابو رافع حضور کے غلام تھے ،انہیں خدمت رسول کا کافی موقع میسر آیا تھا ،ابن عباس ان کے پاس کاتب لے کر جاتے ، دریافت کرتے کہ حضور ﷺ نے فلاں فلاں دن کیا کیا کہا؟ ابو رافع بیان کرتے اور کاتب تحریر کرتا جاتا ۔آپ کے پاس حدیثیں لکھنے اور لکھوانے کی وجہ سے متعدد کتابیں تیار ہو گئی تھیں ۔

تحصیل علم کی اس لگن نے ابن عباس کو حبر الامۃ بنا دیا ۔آپ قرآن ،حدیث ،تفسیر ،فقہ ،ادب و شاعری اور انساب و فرائض میں امتیازی شان کے مالک تھے ۔حضرت عبد اللہ ابن عباس کی مرویات ۱۶۶۶ ر ہیں جن میں سے ۹۵ ر حدیثوں میں بخاری و مسلم متفق ہیں ،۶۸ھ میں ۷۱ ر برس کی عمر میں وصال فرمایا۔

۵۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ :

حضرت ابو ہریرہ کا نسبی تعلق یمن کے مشہور قبیلہ دوس سے تھا ،آپ کے نام کے سلسلہ میں اختلاف ہے ،دور اسلام میں عبد اللہ اور عبد الرحمن ذکر کئے گیے ہیں ،آپ کی کنیت ابو ہریرہ ہے اور یہ کنیت اس قدر مشہور ہوئی کہ لوگوں کو آپ کا قطعی نام یاد نہ رہا۔

حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یمن میں اسلام کی دعوت و تبلیغ سے متاثر ہو کر آپ نے ایک قافلہ کے ساتھ مقام خیبر میں حضور ﷺ کے پاس آ کر اسلام قبول کیا ۔قبول اسلام کے بعد آپ دامن مصطفیٰ ﷺ سے اس طرح وابستہ ہو گئے کہ حضور سے ظاہری زندگی کے آخری لمحات تک جدا نہ ہوئے ۔ شب و روز خدمت اقدس میں حاضر رہتے ۔اس طرح علم نبوی کے اکتساب کا خوب موقع میسر آیا ،عبادات کے علاوہ سارا وقت ذوق علم کی تسکین اور طلب حدیث میں گزرتا تھا ۔یہ ذوق حرص کے درجہ کو پہنچا ہوا تھا ۔آپ کے اس حرص فی العلم کی خود حضور نے تعریف فرمائی جیسا کہ بخاری میں ہے ۔

اس ذوق اور حرص کا ثمرہ یہ ہوا کہ ابو ہریرہ نے محض تین برس کی بارگاہ رسالت میں حاضری سے اصحاب رسول میں حدیث رسول کا سب سے بڑا ذخیرہ حاصل کر لیا ۔اور تمام صحابہ میں سب سے زیادہ حدیثیں روایت کرنے کا مقام پایا ۔حضرت ابو ہریرہ کی مرویات ۵۳۷۴ ر ہیں ان میں سے ۳۲۵ ر حدیثیں متفق علیہ ہیں ۔

ابتدا میں آپ نے صرف حدیثوں کے حفظ پر اکتفا کیا اور اس کا خوب اہتمام کرتے ،فرماتے ہیں : ایک تہائی رات میں عبادت کرتا ،ایک تہائی سوتا اور ایک تہائی میں حضور کی حدیثیں یاد کرتا ۔لیکن بعد میں آپ حدیثیں لکھ کر محفوظ کرنے لگے ۔آپ کے ایک شاگرد بشیر بن نہیک کا بیان ہے ’’میں حضرت ابو ہریرہ سے حدیث کی کتابیں مانگ کر لے جاتا ،اور اسے نقل کرتا اور عرض کرتا کہ ان حدیثوں کو آپ نے حضور ﷺ سے سنا ہے؟ جواب دیتے ہاں ۔‘‘ (محدثین عظام بحوالہ دارمی)

۵۷ھ میں بمقام مدینہ منورہ بعمر ۷۸ ر سال انتقال فرمایا اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے ۔

۶۔ حضرت عبد اللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما:

اسم گرامی عبد اللہ ،کنیت ابو عبد الرحمن ،والد کا نام حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے ۔آپ کی ولادت ۲ نبوی میں ہوئی ۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ابتدائی عمر سے رسول اکرم ﷺ کی صحبت بابرکت سے مستفیض ہونے والے خوش نصیب صحابہ میں سے ہیں ۔سن رشد کو پہنچنے کے بعد قرآن مجید کی تعلیم کے ساتھ

حدیث نبوی کی طلب و جستجو میں مشغول ہو گئے۔

جب بارگاہ رسالت میں حاضر ہوتے تو حضور ﷺ کے احوال و کوائف کا بغور مطالعہ فرماتے، اور اقوال نبوی کو یکسوئی کے ساتھ سماعت فرما کر سینہ میں محفوظ کرتے، جن اوقات میں بارگاہ نبوی میں حاضر نہ ہوتے تو ان اصحاب رسول سے جو موجود ہوتے دریافت کرلیا کرتے۔

ابتدا میں آپ حدیثوں کی کتابت پسند نہیں کرتے تھے، مگر وقت کے تقاضے نے تحریر و کتابت کا احساس پیدا کر دیا اور آپ حدیثیں لکھنے لکھانے لگے۔ آپ کے ممتاز شاگرد حضرت نافع آپ کے رو برو بیٹھ کر آپ کی مرویات لکھا کرتے تھے۔ آپ کے دوسرے شاگرد ابن جبیر اور مجاہد بھی آپ کی بیان کردہ حدیثیں ضبط تحریر میں لاتے تھے، اور پوچھ پوچھ کر ان کی تصحیح کرتے تھے۔ (جامع بیان العلم بحوالہ محدثین عظام)

حضرت عبداللہ بن عمر قرآن، تفسیر، فقہ اور حدیث میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ آپ کی مرویات ۱۶۰۳ ر ہیں جن میں ۱۷۰ ر متفق علیہ ہیں۔ آپ نے کوئی منصب کبھی قبول نہیں کیا اور نہ ہی سیاسی معاملات میں کسی خاص دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ عبادات و اعمال کے علاوہ بشری عادات و اطوار میں بھی اتباع رسول کی کوشش کرتے۔ ۷۳ھ میں بمقام مکہ مکرمہ وفات پائی۔

۷۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالی عنہ:

اسم گرامی جابر، کنیت ابو عبداللہ، والد کا نام عبداللہ، والدہ کا نام نصیبہ اور مدینہ کے مشہور قبیلہ خزرج سے آپ کا تعلق تھا۔ ہجرت سے پہلے بیعت عقبہ ثانیہ میں اپنے والد کے ہمراہ مشرف باسلام ہوئے۔ آپ کے والد عبداللہ نے غزوۂ احد میں اپنی جان رسول اکرم ﷺ کے قدموں پر نثار کر کے مرتبۂ شہادت حاصل کیا۔ اپنے والد کی طرح حضرت جابر بھی رسول اکرم ﷺ اور اسلام کے لیے جاں نثاری کا ثبوت دیتے رہے۔ احد کے بعد تمام غزوات میں شرکت کی، آپ کو ۱۹ر غزوات میں رسول گرامی ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت جابر کو طلب علم کا ایسا شوق تھا کہ آپ نے نبی کریم ﷺ سے اکتساب فیض کرنے کے باوجود بہت سے صحابۂ کرام سے علم حدیث حاصل کیا، ایک ایک حدیث حاصل کرنے کے لیے مہینوں کا سفر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کثیر الروایہ صحابۂ کرام کے طبقہ اول میں شمار کیے جاتے ہیں۔

آپ کی حدیثیں کتابی شکل میں بھی جمع کی گئیں، جو صحیفۂ جابر کے نام سے محدثین کے درمیان مشہور ہے۔ امام احمد بن حنبل کا ایک قول نقل کیا گیا ہے کہ قتادہ قوت حافظہ میں تمام اہل بصرہ سے بڑھے ہوئے تھے، جو کچھ بھی سنتے یاد کر لیتے۔ ایک مرتبہ حضرت جابر کا صحیفہ ان کے سامنے پڑھا گیا تو وہ پورا حفظ ہو گیا۔ عاصم بن عمر بن قتادہ کا بیان ہے کہ میں نے شعبی کے سامنے احادیث کا ایک مجموعہ پیش کیا جس کو میں نے جابر بن عبداللہ سے سن کر لکھا تھا، شعبی نے اس کو دیکھ کر کہا کہ اس صحیفہ کی ساری حدیثیں میں نے جابر سے سنی ہیں۔ (محدثین عظام)

آپ کی کل مرویات ۱۵۴۰ ر ہیں۔ ۶۰ ر میں بخاری و مسلم متفق ہیں۔ آپ کا انتقال ۹۴ ر سال کی عمر میں ۷۸ھ میں ہوا۔ حضرت ابان بن عثمان نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

۸۔ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ:

اسم گرامی سمرہ، کنیت ابو عبد الرحمن، والد کا نام جندب ہے بچپن ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا، والدہ ان کو لے کر مدینہ آئیں۔ مری بن شیبان کی زوجیت میں داخل ہوئیں، سمرہ نے انہیں کے سایۂ عاطفت میں تربیت پائی، ہجرت کے بعد مشرف با سلام ہوئے، سب سے پہلے غزوۂ احد میں شریک ہوئے پھر دیگر تمام غزوات میں مشرکین کے بعد خلاف نبرد آزما ہوئے۔

حضرت سمرہ نے عہد رسالت میں نوعمر ہونے کے باوجود سینکڑوں حدیثیں زبان وحی ترجمان سے سن کر یاد کی تھیں۔ آپ غیر معمولی حافظہ کے مالک تھے جس بات پر دھیان دیتے یاد ہو جاتی تھی۔ آپ احادیث کے حفظ وضبط کا خوب اہتمام کرتے، آپ نے اپنے صاحبزادوں کے لیے احادیث و احکام پر مشتمل ایک گراں قدر کتاب تحریر کی تھی۔ تہذیب التہذیب میں

ہے: سمرہ کی احادیث کا ایک بڑا نسخہ ان کے بیٹے کے پاس تھا ابن سیرین کا بیان ہے یہ رسالہ علم کے بہت بڑے حصہ پر مشتمل ہے۔(مشاہیر حدیث)

آپ اسلام کے زبر دست بہی خواہ ،راست گو، نہایت امانت دار اور دیگر فضائل و اخلاق کے جامع تھے۔کتب احادیث میں آپ کی کل مرویات ۱۲۳ / پائی جاتی ہیں۔

۵۸ھ میں سر دی کا سخت حملہ ہوا علاج کے باوجود جانبر نہ ہو سکے، ایک دن گرمی حاصل کرنے کے لیے کھولتی ہوئی دیگ پر بیٹھے، بیقراری میں دیگ کے اندر گر پڑے اور جل کر وفات پائی۔

حضور ﷺ نے ایک موقع پر حضرت ابوہرہ، ابومحذورہ اور سمرہ سے فرمایا تھا تم تینوں میں سب کے بعد مرنے والا آگ میں جل کر مرے گا۔ چنانچہ حضرت سمرہ کی وفات سے اس پیشین گوئی کی تصدیق ہوئی۔

۹۔ حضرت عمرو بن حزم انصاری رضی اللہ عنہ:

اسم گرامی عمرو، کنیت ابوالضحاک، مدینہ کے مشہور قبیلہ بنونجار سے ہیں۔ بچپن میں اسلام قبول کیا کم سنی کی وجہ سے غزوۂ بدر و احد میں شریک نہ ہو سکے، غزوۂ خندق اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک ہو کر نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کے ہمراہ اسلامی جہاد میں حصہ لیا۔

جب نجران کے لوگوں نے اسلام قبول کیا تو نبی اکرم ﷺ نے حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو نجران کا امیر مقرر فرمایا تاکہ وہاں مسلمانوں کو دین کی تعلیم دیں اور صدقات وصول کریں۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک نوشتہ ان کے نام لکھوا کر ارسال فرمایا جس میں فرائض زکوۃ، دیت اور دیگر دینی احکام و مسائل مذکور تھے۔ آپ نے اس قیمتی نوشتہ کو صرف محفوظ ہی نہ رکھا، بلکہ اکیس دیگر فرامین نبوی بھی فراہم کیے جو مختلف قبائل کے نام رسول اللہ ﷺ نے تحریر کرائے تھے۔ حضرت عمرو بن حزم نے ان تمام دستاویزوں کو ایک مجموعہ میں تحریر فرمایا تھا جو عہد رسالت کے سیاسی دستاویزوں یا سرکاری پروانوں کا اولین مجموعہ شمار کیا جاتا ہے۔ امام زیلعی فرماتے ہیں: حضرت عمرو بن حزم کی یہ کتاب چاروں اماموں کے ہاں مقبول رہی ہے اور یہ امت میں متوارث ہے۔(محدثین عظام بحوالہ نصب الرایہ)

ابن شہاب زہری کہتے ہیں: یہ کتاب چمڑے پر تحریر تھی اور عمرو بن حزم کے پوتے ابو بکر بن محمد بن حزم کے پاس موجود تھی، ابو بکر خود یہ کتاب لے کر میرے پاس آئے تھے اور میں نے اس کو پڑھا۔(محدثین عظام بحوالہ نسائی)

حضرت عمرو بن حزم انصاری رضی اللہ کا وصال مدینہ منورہ میں ۵۱ھ میں ہوا۔

جمع حدیث عہد تابعین میں:

عہد تابعین میں بھی حفاظت حدیث کے سلسلہ میں عہد صحابہ کی طرح اصل اعتماد ضبط صدر پر تھا کہ تابعین عظام احادیث رسول ﷺ کو سن کر اپنے سینوں میں محفوظ کرتے، اور قرآن مجید کی طرح حدیث شریف کو بھی یاد کرتے اور کراتے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں: ’’لانا لصحیفة جابر احفظ منی لسورة البقرة ‘‘حضرت جابر بن عبد اللہ کا صحیفہ (مجموعہ احادیث) سورۂ بقرہ سے بھی زیادہ مجھے یاد ہے۔

(مشاہیر حدیث بحوالہ تاریخ کبیر)

حضرت عطا فرماتے ہیں: ہم لوگ حضرت جابر بن عبد اللہ کے پاس ہوتے پھر جب ان کے حلقہ سے نکل کر باہر نکل آتے تو ان کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو باہم مل کر ہم لوگ دہراتے۔ حضرت عبد الرحمن بن ابی لیلی اپنے شاگردوں سے فرماتے ’’حدیث کو زندہ رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو بار بار دہرایا جائے، پس تم دہراتے رہا کرو۔‘‘ حضرت حسن بصری اپنے شاگردوں کو نصیحت فرماتے: ’’غائلة العلم النسیان و ترك المذاكرة ‘‘علم کی آفت اس کو بھول جانا اور دہرانے کو چھوڑ دینا ہے۔

حضرت ہشام بن عروہ بیان کرتے ہیں کہ میرے والد مجھے اور میرے دوسرے بھائیوں عبد اللہ، عثمان اور اسمٰعیل وغیرہ کو حدیثیں پڑھا دیتے پھر ہم سے دوبارہ سنتے اور کہتے ’’کررواعلیٰ وکان یعجب من حفظی‘‘ یعنی جو کچھ تم نے پڑھا اور یاد کیا ہے وہ مجھ سناؤ اور میری یادداشت سے خوش ہوتے۔(مشاہیر حدیث)۔(جاری)

□□□

حج وزیارت

ایک روحانی اور مقدس مبارک سفر

مولانا محمد ظفر الدین برکاتی
مدیر ماہ نامہ کنز الایمان دہلی
خطبہ نویس کل ہند امام فاؤنڈیشن دہلی

حج نام ہے احرام باندھ کر نویں ذی الحجہ کو میدان عرفات میں ٹھہرنے اور کعبہ معظّمہ کے طواف کا۔ اس کے لئے خاص وقت مقرر ہے جس میں یہ افعال کیے جائیں تو حج ہے۔ حج 9 ہجری میں فرض ہوا، اس کی فرضیت قطعی یقینی ہے، اس کی فرضیت کا انکار کرنے والا کافر ہے۔ (بہار شریعت، حصہ ششم، ۱ / ۱۰۳۵-۱۰۳۶)

* حج کے فرائض (۱) احرام (۲) وقوفِ عرفہ (۳) طواف زیارت۔ حج کی تین قسمیں:

(۱) افراد یعنی صرف حج کا احرام باندھا جائے۔ (۲) تمتّع یعنی پہلے عمرہ کا احرام باندھا جائے پھر عمرہ کے احرام سے فارغ ہونے کے بعد اسی سفر میں حج کا احرام باندھا جائے۔ (۳) قِران یعنی عمرہ اور حج دونوں کا اکٹھا احرام باندھا جائے، اس میں عمرہ کرنے کے بعد احرام کی پابندیاں ختم نہیں ہوتیں بلکہ برقرار رہتی ہیں۔ عمرہ میں صرف احرام باندھ کر خانہ کعبہ کا طواف اور صفا مروہ کی سعی کر کے حلق کروانا ہوتا ہے۔ حج وعمرہ دونوں سے متعلق تفصیلی معلومات کے لئے بہارِ شریعت کے حصہ 6 کا مطالعہ کریں۔ یہ الگ سے ایک مستقل کتاب " اَدائے حج وعمرہ" کے نام سے بھی دستیاب ہے۔

سفرِ حج مسلمانوں کے لئے اسلام کا پانچواں رکن اور زندگی میں ایک بار صاحبِ استطاعت پر فرض عبادت ہے۔ یہ مکہ مکرمہ کا ایک مقدس روحانی سفر ہے جہاں دنیا بھر سے مسلمان اتحاد، اخوت اور تقویٰ کی مثال قائم کرتے ہوئے مخصوص ارکان (احرام، طواف، سعی) ادا کرتے ہیں جس کا مقصد اللہ کی رضا اور گناہوں کی معافی ہے۔ حج ہر اس مسلمان پر فرض ہے جو مالی اور جسمانی طور پر اس کی استطاعت (سامانِ سفر، سواری اور گھر والوں کے لئے نان نفقہ) رکھتا ہو۔ حج کا مقصد اللہ تعالیٰ کے لئے انکساری، تقرب اور برائیوں سے بچنا ہے، جس سے حاجی کے ایمان کی تجدید ہوتی ہے۔ البتہ مقبول حج (حجِ مبرور) وہی ہوتا ہے جو ریاکاری سے پاک ہو، گناہوں سے بچا جائے اور جس کے بعد انسان گناہوں سے تائب رہے۔ عورت کے لئے محرم (شوہر یا قابلِ اعتماد رشتہ دار) کے بغیر حج کا سفر کرنا شرعاً منع ہے۔ آج کل بہت سے ملکوں نے اس کے خلاف کا راستہ کھول دیا ہے جسے قبول نہیں کرنا چاہیے۔ حج کے لئے جانے والے ہر مسلمان کو حج کے ارکان (احرام، طوافِ زیارت، عرفات میں قیام) اور واجبات (صفا مروہ، رمی جمار وغیرہ) کا علم ہونا ضروری ہے تاکہ حج صحیح طور پر ادا ہو سکے۔ ویسے حج ایک عاشقانہ روحانی سفر ہے جو مسلمان کو اپنے رب کے قریب کرتا ہے اور اسے نئے سرے سے زندگی گزارنے کا حوصلہ دیتا ہے۔

یہی حج کا مقصد بھی ہے

قبولِ حج کے لیے تین شرطیں:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ.(پ ۲، البقرۃ: ۱۹۷)

ترجمہ: حج میں نہ فحش بات ہو، نہ ہماری نافرمانی، نہ کسی سے جھگڑا لڑائی۔

اس لئے ان تین باتوں سے دُور رہنا چاہیے، جب غصّہ آئے یا جھگڑا ہو یا کسی معصیت کا خیال ہو تو فوراً سر جھکا کر قلب کی طرف متوجہ ہو کر اس آیت کی تلاوت کرے اور دو ایک بار لاحول شریف پڑھے، یہ بات جاتی رہے گی. ان شاء اللہ. یہی نہیں کہ اسی کی طرف سے ابتدا ہو یا اس کے دوست احباب ہی کے ساتھ جدال بلکہ بعض اوقات امتحاناً راہ چلتوں کو پیش کر دیا جاتا ہے کہ بے سبب اُلجھتے بلکہ اول فول بکتے ہیں اور لعن وطعن کو تیار ہوتے ہیں، ایسے موقع پر ہوشیار رہنا چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دو کلمے میں ساری محنت، سارا خرچ اور پورا سفر برباد ہو جائے۔ دھکا مکی اور کسی کے آگے بڑھ جانے کے چکر میں اس کو دھکا دینا بھی اسی میں آتا ہے اور یہ بھی آداب کے خلاف ہے کہ بزرگوں اور بڑوں سے آگے بڑھنے کے لئے انھیں کسی طرح کی تکلیف دی جائے۔

کسی وقت کی نماز نہ چھوٹے:

خبردار! حج وزیارت کے سفر میں بطور خاص نماز ہرگز نہیں ترک کرنا چاہیے کیونکہ یہ ہمیشہ ہی بہت بڑا گناہ ہے اور سفرِ حج کی حالت میں اور بھی غفلت نہیں کرنا چاہیے کہ جس کے دربار میں جاتے ہو، راستے میں انہی کی نافرمانی کرتے چلو تو بتاؤ کہ تم نے اُن کو راضی کیا یا ناراض؟ خبر ملتی ہے کہ بہت سے حاجی صاحبان کو دیکھا گیا ہے کہ نماز کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے اور تھوڑی سی تکلیف پر نماز چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ شریعت نے جب تک آدمی ہوش میں ہے نماز ساقط نہیں۔ یہ تو عام حالات میں حکم ہے۔

اچھوں اور خوش عقیدوں کی صحبت میں رہیں:

ہر جگہ اچھے برے لوگ ہوتے ہیں اور حرمین شریفین میں برا ہونے کے لئے اتنا کافی ہے کہ حاجی اپنا وقت خراب کرے اور مبارک سفر کا خیال نہ رکھے. اس لئے جس شہر میں جائیں وہاں کے سُنّی عالموں یا ساتھ کے پڑھے لکھے خوش عقیدہ لوگوں کے ساتھ رہیں اور چونکہ سبھی اللہ کے مہمان ہوتے ہیں، اس لئے ہر شخص کے ساتھ ادب واحترام سے پیش آئیں، مقدس مقامات اور مزارات کی زیارت کریں، فضول سیر سپاٹے اور طبیعت کی سیر وسیاحت کی بجائے شریعت کے مطابق روحانی سیر وسیاحت کریں۔

کسی ساتھی یا مسافر کی کوئی بات اپنی نظر میں خلافِ شرع معلوم ہو تو برے الفاظ اور برے لب و لہجے میں اعتراض نہ کریں بلکہ دل میں نیک گمان رکھیں اور محبت سے صحیح مسئلہ بیان کریں۔ کسی کے عمل کی بنیاد پر اس کو حقیر سمجھنا بھی شریعت کو پسند نہیں. ہر حاجی کو چاہیے کہ ذکرِ خدا سے دل بہلائے تاکہ فرشتہ ساتھ رہے، نہ کہ وہ کام کرے جس سے شیطان کا ساتھ ہو۔ ہر سفر خصوصاً سفرِ حج میں اپنے اور اپنے عزیزوں، دوستوں کے لئے دعا سے غافل نہیں رہنا چاہیے کیونکہ مسافر کی دعا قبول ہے اور حج کا مبارک سفر سبحان اللہ۔

حج کا سفر شروع ہونے سے پہلے اور شروع ہونے کے بعد:

جس کا قرض آتا ہو یا امانت پاس ہو ادا کر دے، جن کے مال ناحق لیے ہوں واپس کر دے یا معاف کرا لے، پتا نہ چلے تو اتنا مال فقیروں کو دیدے۔ نماز، روزہ، زکاۃ جتنی عبادات ذمے پر ہوں ادا کرے اور تائب ہو یعنی آئندہ گناہ نہ کرنے کا پکا ارادہ کرے۔ جس کی اجازت کے بغیر سفر مکروہ ہے اس کو راضی کرے جیسے ماں، باپ، شوہر. جس کا اس پر قرض آتا ہے اُس وقت نہ دے سکے تو اُس سے بھی اجازت لے کہ واپسی کے بعد ادا کر دیں گے پھر حجِ فرض کسی کے اجازت نہ دینے سے روک نہیں سکتا، اجازت میں کوشش کرے نہ ملے جب بھی چلا جائے۔

اس سفر سے مقصود صرف اللہ ورسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہوں

، رِیا کاری، دولت مند ہونے کا دکھاوا، ذاتی سماجی اور برادری و قبیلہ کا فخر نہ ہو۔

سفر خرچ اور توشہ مالِ حلال سے لے ورنہ قبولِ حج کی امید نہیں اگر چہ فرض اُتر جائے گا، اگر اپنے مال میں کچھ شُبہہ ہو تو قرض لے کر حج کو جائے اور وہ قرض اپنے مال سے ادا کر دے۔ حاجت سے زیادہ توشہ لے کر جانا چاہیے تاکہ رفیقوں کی مدد اور فقیروں پر تصدق کرتا چلے، یہ حجِ مبرور کی نشانی ہے۔

ایک عالم دین کو ساتھ میں فقہ و شریعت کے مسائل کی کتابیں بقدرِ کفایت ساتھ لے جانا چاہیے تاکہ دوسروں کی رہنمائی کر سکے اور غیر عالم کو عالم دین کے ساتھ جانا چاہیے۔ ہاں اکیلا سفر نہیں کرنا چاہیے کہ منع ہے۔ رفیق دین دار صالح ہو تاکہ دین داری کا بھی رفیق بنے۔ مشہور حدیث پاک ہے کہ ''جب تین آدمی سفر میں جائیں تو اپنے آپس میں ایک کو سردار بنالیں'' اس میں کاموں کا انتظام رہتا ہے، ہاں سردار اُسے بنائیں جو خوش خلق عاقل دین دار ہو، سردار کو چاہیے کہ رفیق سفر احباب کے آرام کو اپنی آسائش پر مقدم رکھے۔

گھر سے چلتے وقت سبھی عزیزوں اور دوست احباب سے ملے اور اپنے قصور معاف کرائے۔ اب اُن پر لازم کہ دل سے معاف کر دیں۔ حدیث میں ہے کہ ''جس کے پاس اس کا مسلمان بھائی معذرت لائے واجب ہے کہ قبول کر لے، ورنہ حوضِ کوثر پر آنا نہ ملے گا''

وقتِ رُخصت سب سے دعا کرائے کہ برکت پائے گا کیونکہ دوسروں کی دعا کے قبول ہونے کی زیادہ امید ہے اور یہ نہیں معلوم کہ کس کی دعا مقبول ہو۔ لہٰذا سب سے دعا کرائے۔

حج کا اصل مقصد اور پس منظر:

حج کا سفر اپنی کسی غرض یا نفس کی خواہش کے لئے نہیں بلکہ صرف اللہ کی رضا اور اس کے حکم کی تعمیل کے لئے کیا جاتا ہے۔ حج کی تلبیہ اور مناسک، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت کی یاد تازہ کرتے ہیں جو قربانی اور اطاعت کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس طرح یہ محض ایک جسمانی سفر نہیں بلکہ روحانی سفر ہے جس میں حاجی کعبۃ اللہ کا طواف کرتا ہے اور قربِ الٰہی حاصل کرتا ہے۔

حج دین اسلام کا پانچواں رکن ہے جو قرآن، حدیث اور اجماعِ امت سے ثابت ہے۔ مناسک حج کی ادائیگی کے دوران اللہ کی رحمت و عنایت اور اجر و ثواب کے بہت سے وعدے ہیں۔

حج کا سفر اور صوفیہ:

حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری (وفات: 782ھ) کے ملفوظات جیسے مخ المعانی اور مکتوبات صدی دوصدی میں تصوف کے رموز، اصلاحِ نفس اور عشقِ الٰہی پر زور ملتا ہے اور حج کی اہمیت بھی معلوم ہوتی ہے، ان کی تعلیمات میں حج بیت اللہ کو محض ایک ظاہری سفر نہیں بلکہ باطنی سفر اور اللہ کی طرف رجوع قرار دیا گیا ہے۔ انہوں نے حج کے مقاصد اور عشقِ رسول ﷺ و محبتِ الٰہی کو حج کا جوہر بتایا ہے۔ ان کے مکتوبات میں مختلف صوفیانہ مسائل اور احکامِ دین پر بحث ملتی ہے، جس میں حاجیوں کے لئے بھی سبق موجود ہیں۔ اسی طرح دیگر صوفیہ کے ملفوظات میں حج کو خالص روحانی سفر قرار دیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حج بیت اللہ تو اک بہانہ ہے اللہ کی ذات و قدرت کی زیارت کا، الوہیت و ربوبیت کو قریب سے دیدار کرنے کا، اور رب کی بارگاہ میں بندوں کی والہانہ عاشقانہ حاضری کا۔ جہاں بندگی اپنی عروج پر ہوتی ہے اور بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے قریب محسوس کرتا ہے، اگر یہ احساس زندہ رہا تو زندگی سنور جاتی ہے اور بندہ دنیا کے کسی بھی کونے میں چلا جائے، رب کی بارگاہ کا حاضر باش نظر آتا ہے۔

صوفیہ کرام کے نزدیک حج صرف ایک جسمانی اور ظاہری عبادت نہیں بلکہ یہ سراسر عشق، محبت اور باطنی پاکیزگی کا سفر ہے۔ صوفیاء حج کے مناسک کو ان کے باطنی روحانی پہلوؤں سے دیکھتے ہیں۔ صوفیہ، حج کو "سفرِ عشق" کہتے ہیں جہاں عاشق (حاجی) اپنے محبوب (اللہ تعالیٰ) کے گھر جاتا ہے۔ ہر رکنِ حج، عشق و محبت

کا عملی مظاہرہ ہے جیسے طوافِ کعبہ میں والہانہ پن۔صوفیہ کے نزدیک احرام، یہ لباسِ دنیا کو اتار کر کفن نما لباس پہننا ہے جو موت اور تجرید (دنیا سے بے تعلقی) کی یاد دلاتا ہے۔کعبہ کے گرد گھومنا اللہ کی محبت میں دیوانہ وار گھومنے کی علامت ہے۔عشقِ الٰہی میں دوڑنے اور تلاش کرنے کی کیفیت کا نام صفا و مروہ کی سعی ہے۔عرفات میں قیام، عارفانہ پہچان اور اللہ سے قربت کا مقام ہے۔منیٰ میں قربانی ،نفسانی خواہشات کو ذبح کرنے کی علامت ہے۔صوفیہ کے نزدیک حج کا مقصد ظاہر کے ساتھ باطن کی اصلاح ہے۔وہ حج کے دوران ذکر، مراقبہ اور خواہشاتِ نفسانی سے بچنے اور محفوظ رہنے پر زور دیتے ہیں۔حج ،صوفیہ کے نزدیک غیر اللہ سے دل کو پاک صاف کرنے کا ذریعہ وسیلہ اور حیلہ ہے۔

ایک صوفیانہ مثال:

حضرت احمد بن اسکاف دمشقی کی مثال ملتی ہے کہ انہوں نے حج کے لئے جمع کی گئی رقم اپنے ضرورت مند ہمسائے کو دے دی، جو صوفیہ کے نزدیک خدمتِ خلق اور انسانیت کی محبت کو حج سے بھی افضل ٹھہراتا ہے۔دوسرا واقعہ حضرت عبد اللہ بن مبارک کا مشہور ہے۔خلاصہ یہ کہ صوفیہ کے لئے حج ، باطنی سفر ہے جو عشقِ الٰہی اور اصلاحِ قلب کی انتہا پر لے جاتا ہے۔حضرت عبد اللہ بن مبارک ایک عظیم محدث، زاہد اور مجاہد تھے جو ایک سال حج اور ایک سال جہاد کرتے۔ان کا مشہور واقعہ یہ ہے کہ ایک بار حج کے سفر کے دوران، کوفہ میں انہوں نے ایک غریب خاندان (سیدانی) کو حاجت مند دیکھ کر حج کے لئے جمع کی گئی 500 اشرفیاں ان کو دے دیں اور حج کی بجائے گھر واپس آ گئے ،لیکن خواب میں انہیں بشارت ملی کہ ان کا حج قبول ہو گیا ہے۔عبد اللہ ابن مبارک کا یہ عمل سکھاتا ہے کہ حاجت مندوں کی مدد کرنا بعض اوقات نفلی حج سے افضل ہوتا ہے۔جب انہوں نے رقم غرباء میں تقسیم کی تو خواب میں ان کا حج قبول ہوا جس کی مبارک بادی حج سے واپس ہونے والوں نے دی۔عبد اللہ بن مبارک اپنی تجارت کی آمدنی کا بڑا حصہ علماء اور غریبوں کی خدمت میں خرچ کرتے۔آپ کا شمار ائمہ سلف اور محدثین میں ہوتا ہے اور آپ کو امیر المومنین فی الحدیث کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

اک مبارک منفرد حج ایسا بھی ہے:

سلطان الہند، حضرت خواجہ معین الدین حسن چشتی اجمیری کا سفرِ حج ان کی روحانی زندگی اور ہندوستان میں دین اسلام کی اشاعت کا سنگ میل اور ایک اہم موڑ ہے۔خواجہ غریب نواز نے اپنے مرشدِ گرامی حضرت خواجہ عثمان ہارونی کے ساتھ حج کا سفر کیا۔روایات کے مطابق ،سفرِ حج کے دوران آپ کو مدینہ منورہ میں بارگاہِ رسالت ﷺ سے ہندوستان میں دین اسلام کی تبلیغ اور ولایت (ہندوستان کی روحانی سپردگی) کی بشارت ملی۔اسی بنیاد پر ہم آپ کو عطاء رسول مانتے ہیں۔یعنی خواجہ غریب نواز کا یہ تاریخی سفر صرف فریضہ حج کی ادائیگی تک محدود نہیں بلکہ یہ آپ کے روحانی کمالات، تصوف کے فیض اور ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کے لئے روحانی ہدایات حاصل کرنے کا سفر تھا۔ان سفروں کے بعد ہی حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ہند تشریف لائے اور اجمیر شریف میں اسلام کا پرچم بلند کیا۔

حج کے بعد یا پہلے:

مدینہ منورہ میں روضہ رسول ﷺ پر حاضری اور سلام پیش کرنا ایک انتہائی فضیلت والا عمل، عشقِ رسول ﷺ کا تقاضہ اور اکابرین اسلام کے نزدیک مستحب ترین عقیدت مندانہ عمل ہے۔اگرچہ یہ حج کے ارکان میں شامل نہیں لیکن نبی کریم ﷺ کی قبرِ انور کی زیارت اور سلام پیش کرنا مومن کے لئے بڑی سعادت ہے۔اس لئے اسلاف نے روضہ رسول ﷺ پر حاضری کے باضابطہ آداب لکھے ہیں:

غسل کریں یا وضو کریں، بہترین لباس پہنیں اور عاجزی و انکساری کے ساتھ مسجد نبوی میں داخل ہوں۔باب جبرائیل سے داخل ہونا افضل ہے۔روضہ اقدس کے سامنے جالیوں سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہو کر، سرہانے کی دیوار کے کونے میں

جوستون ہے، اس کی طرف منہ اور قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے، ادب سے کھڑے ہو کر آہستہ آواز میں سلام عرض کریں:

الصلوٰۃ و السّلام عَلَیکَ یا رَسولَ اللہِ۔

سلام کے بعد تھوڑا دائیں ہٹ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو سلام پیش کریں پھر اپنے اور تمام مسلمانوں کے لئے دعا کریں۔

مسجد نبوی اور روضہ رسول ﷺ پر بلند آواز سے بات کرنے سے گریز کریں۔ مدینہ منورہ میں قیام کے دوران بار بار سلام پیش کرنا اور مسجد نبوی میں نمازیں ادا کرنا باعثِ برکت ہے۔ حاضری کا مقصد عشقِ رسول ﷺ اور ان کی تعلیمات کی تجدید ہونا چاہیے۔

آج کل ایسا نظام بھی ہے کہ بہت سے حاجیوں کو پہلے مدینہ منورہ بھیج دیتے ہیں پھر حج کے بعد سیدھے گھر واپسی ہو جاتی ہے تو یہ قانونی انتظامی مجبوری ہے لیکن ہونا یہی چاہیے کہ حج سے فارغ ہو کر روضۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری دینا اور سلام پیش کرنا افضل ترین مستحب ہے اور ہر مسلمان کو چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اظہار محبت کرتے ہوئے حج سے فارغ ہو کر آقا کے روضۂ اقدس پر حاضری دے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ''جس نے حج کیا اور میری زیارت نہیں کی بلاشبہ اس نے مجھ سے بے رخی کی''۔

الترغیب والترہیب میں ہے: عن ابن عمر عند ابن عدی و الدار قطنی: من حج و لم یزرنی فقد جفانی." (کتاب الحج، ج:2، ص:235، ط: دار إحياء التراث العربي)

مجاہد جنگ آزادی 1857ء حضرت مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی لکھتے ہیں: ہمارے نبی صلّی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلّم کی قبرِ انور کی طرف سفر افضل مندوب بلکہ واجب کے قریب ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری فرماتے ہیں: بندوں کو حکم ہے کہ اِن (نبیِّ کریم صلّی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلّم) کی بارگاہ میں حاضر ہو کر توبہ و استغفار کریں۔ اللہ تو ہر جگہ سنتا ہے، اُس کا علم، اس کا سننا، اس کا دیکھنا سب جگہ ایک سا ہے مگر حکم یہی فرمایا کہ میری طرف توبہ چاہو تو میرے محبوب صلّی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلّم کے حضور حاضر ہو۔ (فتاویٰ رضویہ)

پیغامِ عمل:

والدین کی خدمت کرنا، ان سے محبت کرنا اور ان کے دیدار کو مقبول حج و عمرہ کے برابر ثواب قرار دیا گیا ہے جبکہ ان کی طرف سے حج بدل (10 حج کا ثواب) یا عمرہ کرنا عظیم سعادت اور ایصالِ ثواب کا بہترین ذریعہ ہے۔ والدین کی قلیل خدمت پر بھی اللہ تعالیٰ کثیر بدلہ عطا فرماتا ہے۔ والدین کے چہرے کو محبت سے دیکھنا مقبول حج اور عمرے کا ثواب رکھتا ہے، جتنی بار دیدار کریں گے، اتنا ہی ثواب ملے گا۔ جو شخص اپنے والدین کی طرف سے حج (حجِ بدل) کرتا ہے تو ان کا حج تو ادا ہو ہی جاتا ہے، ساتھ ہی کرنے والے کو 10 حج کا ثواب ملتا ہے۔ والدین (زندہ یا مرحوم) کی طرف سے عمرہ کرنا اور اس کا ثواب انہیں بخشنا جائز ہے اور اس کا ثواب ان تک پہنچتا ہے۔ والدین کی خدمت، ان کا ادب اور ان کی ضروریات پوری کرنا دنیا و آخرت کی بھلائی کا ذریعہ ہے۔ والدین کی خدمت کو" جنت کی ضمانت" اور" جنت کے دو دروازے" قرار دیا گیا ہے۔ والدین کے چہرے کو محبت اور عقیدت کی نظر سے دیکھنا عبادت ہے۔ احادیث کے مطابق، ایک فرماں بردار اولاد جب اپنے ماں باپ کو محبت سے دیکھتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے مقبول حج اور عمرے کا ثواب عطا فرماتا ہے۔ یہ ایک عظیم نیکی ہے جو والدین کی تکریم اور ان کے ساتھ حسن سلوک کے صلے میں میسر آتی ہے۔ دراصل ہر نظرِ محبت پر نیکی اور مقبول حج / عمرے کا ثواب ملتا ہے۔ اگر یہ عمل ان کی عزت اور انہیں خوش کرنے کی نیت سے کیا جائے تو یہ باعثِ برکت ہے۔ سبحان اللہ

□□□

عبادت کی روح اور اظہار کے شور کا تصادم

(عبادت، نمائش اور زوالِ احساس پر ایک تنقیدی نوٹ)

■ مولانا محمد ملک الظفر سہسرامی
مدیر اعلیٰ مجلہ الکوثر، دار العلوم خیریہ نظامیہ سہسرام

وقت کی رفتار جب تہذیبوں کے مزاج بدلتی ہے تو سب سے پہلے عبادتوں کی روح متاثر ہوتی ہے۔ اعمال باقی رہتے ہیں مگر ان کے اندر کی خاموشی، خشوع اور اخلاص آہستہ آہستہ کم ہونے لگتا ہے۔ صورتیں قائم رہتی ہیں مگر کیفیتیں رخصت ہونے لگتی ہیں۔ سجدے باقی رہتے ہیں مگر ان میں گریہ وگداز کی وہ حرارت نہیں رہتی جو کبھی دلوں کو پگھلا دیتی تھی۔ زبانوں پر اذکار جاری رہتے ہیں مگر دل دنیا کے ہنگاموں میں الجھے رہتے ہیں۔ یوں انسان بظاہر عبادت کرتا ہے مگر اس کی روح کہیں راستے میں چھوٹ جاتی ہے۔ ہر دور میں اہلِ دل نے اسی خطرے سے خبردار کیا ہے کہ عبادت صرف افعال وحرکات کا نام نہیں بلکہ ایک باطنی کیفیت، ایک روحانی حضوری اور ایک خموش تعلق کا نام ہے۔ یہ محض قیام ورکوع اور سجدے کی ترتیب نہیں بلکہ دل کے اُس سفر کا عنوان ہے جس میں انسان اپنے ظاہر کے شور سے نکل کر اپنے باطن کی دنیا میں اترتا ہے۔ وہاں لفظ کم ہوتے ہیں اور احساس زیادہ بولتے ہیں۔ زبان خموش بھی ہو تو دل دعا مانگ رہا ہوتا ہے، آنکھیں بند بھی ہوں تو روح اپنے رب کے سامنے جھکی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

عبادت کی اصل روح اسی لمحۂ حضوری میں پوشیدہ ہے جب بندہ دنیا کی نگاہوں سے بے نیاز ہو کر صرف خدا کی نگاہ کا طالب بن جائے۔ جب سجدہ محض زمین پر پیشانی رکھنے کا عمل نہ رہے بلکہ اپنے غرور، اپنی خواہشات اور اپنی انا کو ربِّ کائنات کے سامنے جھکا دینے کا استعارہ بن جائے۔ جب دعا صرف الفاظ کی تکرار نہ ہو بلکہ شکستہ دل کی ایک خموش فریاد بن جائے جو عرش تک پہنچتی ہے۔ اسی لیے اہلِ معرفت نے ہمیشہ عبادت کے ظاہر سے زیادہ اس کے باطن کی حفاظت فرمائی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر دل حاضر نہ ہو تو جسم کی حرکات ایک عادت تو بن سکتی ہیں مگر عبادت نہیں۔ کیونکہ عبادت کا حسن اُس کیفیت میں ہے جہاں انسان خود کو مخلوق کے ہجوم سے الگ محسوس کرتا ہے اور اُس کا دل ایک ایسی خموشی میں داخل ہو جاتا ہے جہاں صرف رب کی عظمت باقی رہ جاتی ہے۔ وہ خموشی جس میں آنسو بھی آواز نہیں کرتے، وہ تعلق جس میں اظہار سے زیادہ اخفا محبوب ہوتا ہے اور وہ حضوری جس میں انسان اپنے گرد موجود دنیا کو بھول کر صرف ایک ذات کے سامنے خود کو کھڑا محسوس کرتا ہے------ یہی عبادت کی حقیقی روح ہے۔ کیوں کہ عبادت خموشی میں زندہ رہتی ہے ہجوم میں نہیں۔

مگر جب یہی عبادت مسلسل نمائش، کیمروں، تصویروں اور دنیا کی توجہ کے حصار میں آ جائے تو اُس کی باطنی لطافت مجروح ہونے لگتی ہے۔ پھر افعال تو باقی رہتے ہیں مگر کیفیات رخصت ہو جاتی ہیں، سجدے باقی رہتے ہیں مگر ان میں ٹوٹنے کی وہ لذت نہیں رہتی اور دعائیں باقی رہتی ہیں مگر ان کے اندر وہ بے بسی اور وارفتگی کم ہونے لگتی ہے جو کبھی بندے کو خدا کے قریب لے جاتی تھی۔

مسجدوں کی فضائیں اسی لیے مقدس سمجھی جاتی تھیں کہ وہاں انسان اپنے باطن کا شور دبا کر ربّ کائنات کی طرف متوجہ ہوتا تھا۔ وہاں نگاہیں جھک جاتی تھیں، آوازیں مدھم ہوجاتی تھیں اور دلوں پر ایک ایسی ہیبت طاری ہوتی تھی جس میں انسان خود کو دنیا سے لاتعلق محسوس کرتا تھا۔ مگر جدید تہذیب نے انسان کو اس قدر اظہار پسند بنا دیا ہے کہ اب وہ اپنے انتہائی نجی اور مقدس لمحات بھی دنیا کی نظروں سے چھپا کر رکھنے پر آمادہ نہیں۔ عبادت، جو کبھی بندے اور خدا کے درمیان ایک راز سمجھی جاتی تھی، اب آہستہ آہستہ منظر، نمائش اور تشہیر میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ خاموش دعائیں اب کیمروں کے حصار میں ہیں، سجدے اسکرینوں میں قید ہو رہے ہیں، اور آنسو بھی "کانٹینٹ" بنتے جا رہے ہیں۔

روح جب منظر بن جائے تو تاثیر مرنے لگتی ہے۔

یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب تہذیب اپنے باطن سے خالی ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جس معاشرے میں اخلاص کی جگہ اظہار لے لے، وہاں عبادتیں باقی تو رہتی ہیں مگر ان کی تاثیر کم ہونے لگتی ہے۔ پھر مسجدیں آباد ہونے کے باوجود دل ویران رہتے ہیں اور حرم کے وسیع صحنوں میں بھی انسان اپنے رب سے زیادہ اپنی تصویر کے بارے میں فکر مند دکھائی دیتا ہے۔ طواف کی گردش تو جاری رہتی ہے مگر دلوں کی گردش خدا کی طرف نہیں ہو پاتی۔

جسم کعبے کے گرد ہوتا ہے، دل دنیا کے گرد، ہونٹ دعا مانگتے ہیں لیکن ذہن اس فکر میں الجھا رہتا ہے کہ منظر کیسا آ رہا ہے، زاویہ درست ہے یا نہیں، اور یہ لمحے دنیا کے سامنے کس انداز میں پیش کیے جائیں۔ یوں عبادت آہستہ آہستہ حضوری سے نمائشی کیفیت کی طرف منتقل ہونے لگتی ہے۔ بندہ خدا کے سامنے جھکنے کی بجائے نگاہوں کے ہجوم میں جینے لگتا ہے۔ اخلاص وللّٰہیت جو عبادت کی جان تھی، تعریف وتحسین کی خواہش میں کہیں دب جاتی ہے۔ اور پھر وہ لمحے، جو کبھی دلوں کی تطہیر کا ذریعہ بنتے تھے، محض یادگار تصویروں اور عارضی تأثر آفرینی کا سامان بن کر رہ جاتے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ انسان کو اس تبدیلی کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ عبادت کر رہا ہے، حالاں کہ اس کے باطن میں خموشی کی جگہ ایک مسلسل شور برپا ہوتا ہے۔ کیمرے کی آنکھ اُس کی توجہ اس طرح تقسیم کر دیتی ہے کہ حضوریِ قلب کا وہ کیف، جو عبادت کا اصل جوہر ہے، آہستہ آہستہ معدوم ہونے لگتا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے جب مقدس ترین مقامات بھی انسان کے اندر وہ لرزش پیدا نہیں کر پاتے جو کبھی اللہ والوں کے دلوں کو بے اختیار رُلا دیتے تھے۔ نہ نگاہوں میں وہ حیا باقی رہتی ہے، نہ دعا میں وہ ٹوٹ پھوٹ، نہ سجدوں میں وہ بے خودی۔ صرف ہجوم رہ جاتا ہے، تصویریں رہ جاتی ہیں، آوازیں رہ جاتی ہیں مگر روحِ عبادت کہیں پس منظر میں کھو جاتی ہے اور پھر عبادت ایک رسمی انداز میں باقی رہتی ہے، بندگی نہیں۔

زیرِ نظر سطور اسی بدلتے ہوئے مذہبی مزاج، احساسِ تقدس کے زوال اور حرم و مسجد کے آداب سے دور ہوتی ہوئی نئی ذہنیت پر ایک دردمندانہ اور تنقیدی نوٹ ہیں۔ مقصد محض کسی طبقے یا فرد پر اعتراض نہیں بلکہ اس روحانی خسارے کی نشاندہی ہے جو رفتہ رفتہ ہماری عبادتوں کے باطن کو کھوکھلا کرتا جا رہا ہے۔ وہ خسارہ جو بظاہر نظر نہیں آتا مگر آہستہ آہستہ دلوں کی حرارت، آنکھوں کی نمی، دعا کی تاثیر اور سجدوں کی لذات اپنے اندر جذب کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ تنقید دراصل اُس بدلتی ہوئی ذہنیت پر ہے جس میں عبادت کا تعلق خدا سے کم اور دنیا کی نگاہوں سے زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ جہاں خموش بندگی کی جگہ اظہار نے لے لی ہے اور اخلاص کی جگہ تحسین کی خواہشات نے۔ حالاں کہ عبادت کی اصل خوبصورتی اسی میں تھی کہ وہ بندے اور رب کے درمیان ایک ایسا راز رہے جسے شہرت کی ہوا بھی نہ چھو سکے۔ اہلِ دل ہمیشہ اس بات سے خوف زدہ رہے کہ کہیں عمل کی ظاہری رونق اس کے باطن کی روشنی ہضم نہ کر جائے۔ کیونکہ جب عبادت نمائش میں تبدیل ہونے لگتی ہے تو سب سے پہلے اس کی تاثیر کم ہوتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ

انسان اعمال کی انجام دہی میں تو مصروف رہتا ہے مگر ان اعمال سے دلوں میں انقلاب پیدا نہیں ہوتا۔ زبان پر تلاوت رہتی ہے مگر روح تشنہ رہتی ہے، پیشانی سجدوں سے آشنا رہتی ہے مگر آنکھیں گریہ کی دولت سے محروم ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ روحانی زوال ہے جس کا احساس آج پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے کہ اگر عبادت کے مقدس لمحے بھی دنیاوی اظہار، تصویروں اور مصنوعی تاثر آفرینی کے شور میں گم ہو جائیں تو پھر انسان کے پاس ظاہری مذہب تو باقی رہ جاتا ہے مگر اُس مذہب کی وہ اندرونی روشنی باقی نہیں رہتی جو دلوں کو زندہ اور روحوں کو منور کرتی تھی۔ اصل خطرہ یہی ہے کہ کہیں ہم عبادت کی صورت محفوظ کرتے کرتے اُس کی روح نہ کھو بیٹھیں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری مسجدیں آباد رہیں مگر دلوں کے اندر کی محرابیں ویران ہو جائیں۔

کیونکہ جب عبادت تماشہ بننے لگے تو سب سے پہلے اخلاص زخمی ہوتا ہے اور جب اخلاص زخمی ہو جائے تو عمل کی ظاہری خوبصورتی بھی اپنے اندر کی روشنی کھونے لگتی ہے۔ پھر عبادت صرف ایک حرکت بن کر رہ جاتی ہے، اُس میں وہ تاثیر باقی نہیں رہتی جو کبھی دلوں کو بدل دیتی تھی۔ سجدے کیے جاتے ہیں مگر روح جھکتی نہیں، دعائیں مانگی جاتی ہیں مگر دل حاضر نہیں ہوتے اور زبان پر ذکر جاری رہتا ہے مگر باطن دنیا کی تحسین کا اسیر بنا رہتا ہے۔ اخلاص دراصل عبادت کی وہ خموش روح ہے جو دکھائی نہیں دیتی مگر پورے عمل کو زندہ رکھتی ہے۔ اخلاص مر جائے تو عبادت صرف عادت رہ جاتی ہے۔

یہی وہ پوشیدہ نور ہے جو بظاہر مختصر سے عمل کو بھی آسمانوں کی رفعتوں تک پہنچا دیتا ہے۔ مگر جب انسان کی نگاہ خدا سے زیادہ مخلوق کی طرف اٹھنے لگے تو یہی نور مدھم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر انسان عبادت کم اور اپنی عبادت کا اظہار زیادہ کرنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ والوں نے ہمیشہ گمنام عبادت کو پسند کیا۔ ان کے نزدیک وہ آنسو زیادہ قیمتی تھے جو اندھیری رات میں صرف خدا دیکھے، وہ سجدہ زیادہ محبوب تھا جس کی خبر زمین کو بھی نہ ہو اور وہ دعا زیادہ مؤثر تھی جو شہرت کے شور سے محفوظ رہے۔ کیونکہ عبادت کی اصل قوت اس کی پوشیدگی، عاجزی اور بے ساختگی میں ہے، نہ کہ اس کی نمائش اور تشہیر میں۔ جب عبادت کی جگہ منظر سازی لے لے تو رفتہ رفتہ دل کی کیفیت بدلنے لگتی ہے۔ انسان رب کے حضور کھڑا ہونے کی بجائے لوگوں کی نظروں میں کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ پھر حرم کی پاکیزہ فضائیں بھی اُس کے اندر وہ انقلاب پیدا نہیں کر پاتیں جو کبھی ایک لمحۂ حضوری سے زندگیوں کا رخ بدل دیا کرتا تھا۔ خطرہ صرف کیمرے کا نہیں بلکہ اُس ذہنیت کا ہے جو عبادت کو بھی اظہار کا ذریعہ سمجھنے لگی ہے اور یہیں سے زوال شروع ہوتا ہے: ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بندگی کا سب سے خوبصورت لمحہ وہ ہوتا ہے جہاں بندہ، اُس کا رب، اور خاموشی کے سوا کوئی چوتھا موجود نہ ہو۔

اور جب بندگی کی خلوت پر اظہار کی خواہش غالب آ جائے تو پھر عبادت کی وہ خموش عظمت، جو کبھی دلوں کو لرزا دیتی تھی، آہستہ آہستہ منظر سازی کے شور میں دبنے لگتی ہے۔ آج حرمِ کعبہ کے تعلق سے اٹھنے والی بحث دراصل اسی بدلتی ہوئی ذہنیت کا ایک آئینہ ہے۔

چند روز سے سوشل میڈیا پر ایک خبر نہایت شدّت کے ساتھ گردش کر رہی ہے کہ سعودی حکومت نے مسجدِ حرام اور اس کے اطراف فوٹوگرافی و ویڈیوگرافی پر سخت پابندی عائد کرتے ہوئے دس ہزار ریال جرمانہ اور دیگر تعزیری اقدامات کا اعلان کیا ہے۔ بعد میں بعض ذرائع سے یہ وضاحت بھی سامنے آئی کہ اس خبر کی اصل صورت وہ نہیں جو سوشل میڈیا نے بنا دی ہے، تاہم اس پورے قضیے نے ایک ایسا دردناک پہلو ضرور نمایاں کر دیا ہے جس سے آنکھیں چرانا اب ممکن نہیں رہا۔

اصل سوال یہ نہیں کہ جرمانہ واقعی نافذ ہوا یا نہیں بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ کیا حرمِ کعبہ اب بھی ہمارے لیے عبادت، خشوع،

گریہ اور حضوریِ قلب کا مقام ہے یا وہ رفتہ رفتہ ایک مذہبی اسٹیج، ایک روحانی پس منظر (background) اور ایک جذباتی سیاحتی مقام بنتا جا رہا ہے؟

یہ ایک ایسا سوال ہے جس سے آج کا مسلمان مسلسل فرار اختیار کر رہا ہے۔

وہ مسجد جس کے بارے میں سلف صالحین کا حال یہ تھا کہ اس میں قدم رکھتے ہی دل لرز جاتے تھے، نگاہیں جھک جاتی تھیں، آوازیں مدھم ہو جاتی تھیں، آج اسی مسجد کے صحن میں بعض لوگ اس طرح موبائل بلند کیے پھرتے ہیں جیسے وہ کسی تفریحی مقام کی یادگار محفوظ کر رہے ہوں۔ طواف جیسی عظیم عبادت، جو سراپا فنا، توجہ اور حضوری کا نام ہے، اب بعض لوگوں کے نزدیک "لائیو اسٹریمنگ" کا منظر بن چکی ہے۔

کسی کے ہاتھ میں سیلفی اسٹک ہے، کوئی خانۂ کعبہ کے سامنے مخصوص زاویہ تلاش کر رہا ہے، کوئی سجدے کی تصویر محفوظ کر رہا ہے اور کوئی اپنا ہر عمل دنیا بھر کے سامنے نشر کرنے میں اس قدر مشغول ہے کہ اسے نہ حرم کی ہیبت محسوس ہوتی ہے، نہ عبادت کی روح، نہ دوسروں کی اذیت اور نہ اخلاص کے مجروح ہونے کا اندیشہ۔

یہ وہی امت ہے جس کے اکابر نے عبادت چھپانے کو عبادت کی حفاظت قرار دیا تھا۔ جن کے یہاں نفل عبادتوں کا چرچا بھی ریا کے خوف سے معیوب سمجھا جاتا تھا۔ جن کے نزدیک آنسو اور سجدے بندے اور رب کے درمیان ایک راز تھے۔

ایسا راز جسے نہ شہرت کی ہوا چھو سکتی تھی، نہ تحسین کی نگاہیں آلودہ کر سکتی تھیں۔ وہ اپنے درد کی ساری کائنات دعا کی چادر میں لپیٹ کر رات کی تنہائیوں میں رکھ دیتے، اور اپنی بندگی کو خموشی کے اس مقام تک لے جاتے جہاں آوازیں نہیں، صرف قبولیت کی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔ ان کے نزدیک عبادت کا حسن اس کے اظہار میں نہیں، اس کے اخفا میں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جو سجدے زمین پر گمنام رہتے ہیں، آسمانوں میں وہی سب سے زیادہ پہچانے جاتے ہیں۔

اسی لیے ان کی آنکھوں کے آنسو بھی چراغِ نمود نہیں بنتے تھے بلکہ خوفِ خدا اور محبتِ الٰہی کی ایسی شبنم ہوتے تھے جو دل کی مٹی کو نرم اور روح کی فضا کو معطر کر دیتی تھی۔ لیکن آج معاملہ یہ ہے کہ بعض لوگ عمرہ مکمل ہونے سے پہلے اپنی "ریلز" مکمل کرنے کی فکر میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

المیہ یہ ہے کہ اس طرزِ عمل کو صرف ایک وقتی کمزوری نہیں بلکہ ایک نئی مذہبی ثقافت بنا دیا گیا ہے۔ اب بعض نوجوانوں کے نزدیک عبادت اُس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک اس کی تصویر، ویڈیو یا اسٹیٹس دنیا کے سامنے نہ آ جائے۔ گویا اخلاص کی جگہ اظہار نے لے لی، حضوریِ قلب کی جگہ کیمرے کے زاویوں نے لے لی، اور بندگی کی سادگی کو نمائش کی چکا چوند نگل گئی۔

سب سے زیادہ افسوس اُن لوگوں پر ہوتا ہے جو خود کو سنت کا علم بردار، دینداری کا نمائندہ اور عشقِ رسول ﷺ کا دعوے دار کہتے ہیں مگر مسجد کے اندر موبائل ہاتھ میں لیے اس طرح گھومتے ہیں جیسے حرم نہیں بلکہ کوئی مذہبی نمائش گاہ ہو۔ بعض حضرات تو دوسروں کی عبادت تک کی ویڈیوز بنانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔ عورتوں کی تصویریں، نمازیوں کے چہرے، روتے ہوئے زائرین کے مناظر------سب کچھ ایک "کانٹینٹ" میں تبدیل ہو چکا ہے۔

یہ صرف ایک فقہی مسئلہ نہیں، یہ احساسِ تقدس کے زوال کا مسئلہ ہے۔ مسجد صرف اینٹ اور پتھر کا نام نہیں ہوتی۔ مسجد ایک کیفیت کا نام ہے۔ ایک ادب کا نام ہے۔ ایک خاموشی کا نام ہے۔

وہ خاموشی جس میں دل اپنی بکھری ہوئی آوازیں سمیٹ کر خدا کے حضور رکھ دیتا ہے اور روح دنیا کے شور سے نکل کر سکون کی ایسی وادی میں داخل ہو جاتی ہے جہاں ہر سانس عبادت محسوس ہونے لگتی ہے۔

مسجد وہ جگہ ہے جہاں پیشانیاں فقط جھکتی نہیں، دل بھی نرم ہوتے ہیں۔ جہاں اذان کی صدا صرف کانوں تک نہیں پہنچتی بلکہ

انسان کے باطن میں اتر کر اسے اس کی اصل پہچان یاد دلاتی ہے۔

وہاں وقت بھی جیسے آہستہ چلنے لگتا ہے، لہجے دھیمے ہو جاتے ہیں اور نگاہوں میں ایک عجیب سی حیا اتر آتی ہے۔

مسجد دراصل مٹی سے آسمان تک جانے والے اس راستے کا نام ہے جس پر چلتے ہوئے انسان اپنے بوجھ اتارتا اور اپنے رب کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔

یہ صرف عبادت کی جگہ نہیں، دلوں کی طہارت، روح کی تربیت اور بندگی کے نور سے بھر جانے والی ایک مقدس فضا کا نام ہے۔ وہاں انسان اپنے ظاہر سے زیادہ اپنا باطن سنوارتا ہے۔ وہاں نگاہیں زمین پر اور دل آسمان کی طرف ہوتے ہیں۔ مگر جب عبادت گاہ میں مسلسل کیمروں کی چمک، موبائل کی اسکرینیں، بلند آوازیں، مصنوعی انداز اور نمائشی حرکات بڑھنے لگیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ روح کمزور اور مظاہر طاقتور ہو رہے ہیں۔

آج حرمین شریفین میں بعض اوقات ایسا منظر دکھائی دیتا ہے کہ ایک شخص دعا مانگ رہا ہے اور دوسرا اس کی ویڈیو بنا رہا ہے۔ کوئی قرآن کی تلاوت میں مصروف ہے اور برابر میں کھڑا شخص کیمرہ اس کے چہرے پر مرکوز کیے ہوئے ہے۔ طواف کی روانی موبائل کے لیے رک جاتی ہے، راستے بند ہو جاتے ہیں، دوسرے زائرین کو تکلیف پہنچتی ہے مگر صاحبِ موبائل کے احساس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہ طرزِ عمل صرف خلافِ ادب نہیں بلکہ روحِ عبادت کے بھی منافی ہے۔

اسلام نے عبادت کو تماشا بنانے کی اجازت کبھی نہیں دی۔ شریعت نے اخلاص کو عمل کی جان قرار دیا ہے۔ اور اخلاص اُس وقت شدید خطرے میں پڑ جاتا ہے جب بندہ ہر عبادت کے بعد دنیا کی نگاہوں کا طلبگار بن جائے۔ کیونکہ جس لمحے انسان کی نظر خدا سے ہٹ کر مخلوق کی تحسین پر ٹھہرنے لگتی ہے، اُسی لمحے عبادت کی روح کمزور پڑنے لگتی ہے۔

ریاکاری ہمیشہ شور سے جنم لیتی ہے، جبکہ اخلاص خموشی میں پروان چڑھتا ہے۔ اللہ والوں نے اسی لیے اپنے آنسو چھپائے، اپنے تہجدوں کو پردۂ شب میں رکھا اور اپنے سجدوں کو گمنامی کی چادر اوڑھا دی۔ وہ جانتے تھے کہ جن اعمال کو زمین پر زیادہ شہرت مل جاتی ہے، کبھی کبھی آسمانوں میں اُن کا وزن کم ہو جاتا ہے۔ عبادت کا اصل حسن یہ نہیں کہ لوگ اُسے دیکھ لیں بلکہ یہ ہے کہ رب اُسے قبول فرما لے۔ اسی لیے اہلِ دل ہمیشہ اپنے عمل سے زیادہ اپنے اخلاص کی فکر کرتے تھے۔ انہیں خوف رہتا تھا کہ کہیں تعریف کی ایک نگاہ، نمود کی ایک خواہش، یا واہ واہ کا ایک لمحہ اُن کی برسوں کی عبادت کو اندر ہی اندر کھوکھلا نہ کر دے۔

چنانچہ بندگی کی سب سے روشن ساعتیں وہی ہوتی ہیں جو لوگوں کی نظروں سے اوجھل اور صرف خدا کے علم میں ہوتی ہیں۔ کیونکہ راز کی طرح کی جانے والی عبادت میں ایک ایسی تاثیر ہوتی ہے جو دل کو بھی منور کرتی ہے اور روح کو بھی خدا کے قریب لے جاتی ہے۔

سوال محض یہ نہیں کہ تصویر کشی کے باب میں فقہی رخصت کی کوئی گنجائش موجود ہے یا نہیں اصل سوال یہ ہے کہ جن چیزوں کو حالاتِ زمانہ اور ضرورتِ شرعیہ کے تحت محدود درجے میں برداشت کیا گیا، کیا انہیں عبادت گاہوں کے تقدس پر بھی مسلط کر دیا جائے؟ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ اسلام نے تصویر سازی اور جانداروں کی تصویروں کے باب میں نہایت سخت وعیدیں بیان کی ہیں۔ امت کے اکابر، فقہاء اور اہلِ فتویٰ نے ہمیشہ اسے انتہائی احتیاط کا مسئلہ قرار دیا۔ بعد کے ادوار میں جب حالات بدل گئے، شناختی دستاویزات، سفری ضروریات، سیکورٹی اور دیگر ناگزیر تقاضے سامنے آئے تو بعض اہلِ علم نے شدید مجبوری اور ضرورتِ شرعیہ ملجیہ کے تحت محدود درجے میں گنجائش کی بات کی مگر یہ رخصت کبھی بھی اس معنیٰ میں نہ تھی کہ تصویر کشی کو ایک عمومی تہذیب، مذہبی ذوق یا عبادت کا جزو بنا لیا جائے۔ رخصت ہمیشہ ضرورت کے دائرے میں رہتی ہے اور جب رخصت ذوق، شوق، نمائش اور تفریح میں تبدیل ہونے لگے تو پھر وہی چیز روحانی خرابی کا سبب بن جاتی ہے۔ حرمِ کعبہ، مسجدِ نبوی ﷺ اور دیگر

مساجد وہ مقدس مقامات ہیں جہاں انسان کو اپنے ظاہر سے زیادہ اپنے باطن کی فکر کرنی چاہیے۔ وہاں کیمرے سے زیادہ دل کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے اور تصویر محفوظ کرنے سے زیادہ اپنے اعمال اور نیت کی حفاظت مطلوب ہے۔ افسوس یہ ہے کہ آج بعض لوگوں نے اضطراری اجازت کو مذہبی ثقافت بنا دیا ہے۔ ضرورت کے نام پر ملنے والی محدود سہولت اب فخر، اظہار اور تشہیر کا ذریعہ بنتی جا رہی ہے۔ حالاں کہ جس شریعت نے ضرورتاً کسی شی کی گنجائش دی ہو، وہ ہرگز یہ پسند نہیں کرتی کہ اُسی چیز کو مقدس مقامات کی روحانیت پر غالب کر دیا جائے۔ اس لیے اصل مسئلہ محض تصویر کا نہیں بلکہ احساسِ ادب، روحِ عبادت اور تقدسِ حرم کا ہے کیونکہ بعض اوقات ایک مباح یا اضطراری شے بھی جب حد سے بڑھ جائے تو وہ دل کی نورانیت اور عبادت کی تاثیر کو شدید نقصان پہنچانے لگتی ہے۔

کیا مسجد وہ جگہ ہے جہاں انسان اپنی روح کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکائے یا وہ مقام ہے جہاں وہ اپنے "فالوورز" کے لیے جذباتی مناظر جمع کرے؟

کیا خانۂ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر پہلی فکر یہ ہونی چاہیے کہ "ویڈیو اچھی آ رہی ہے یا نہیں؟"

یہ وہ سوالات ہیں جن سے فرار ممکن نہیں۔

افسوس اس بات کا ہے کہ برصغیر کے بہت سے مذہبی حلقوں میں بھی اب اس بیماری کو باقاعدہ فروغ دیا جا رہا ہے۔ بعض لوگ پورے عمرہ اور حج کو "ولاگ" بنا دیتے ہیں۔ بعض مساجد میں نماز کے بعد اجتماعی تصویریں ایک معمول بنتی جا رہی ہیں۔ بعض واعظین اور مذہبی شخصیات نے بھی اس روش کو اس قدر عام کر دیا ہے کہ نئی نسل اب اسے عبادت کا حصہ سمجھنے لگی ہے۔

حالاں کہ ہمارے اکابر کا مزاج اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ شہرت سے بھاگتے تھے، اپنے اعمال چھپاتے تھے اور مسجد کے آداب کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک مسجد میں داخل ہونا گویا بارگاہِ الٰہی میں حاضری تھا، نہ کہ کسی ڈیجیٹل اسٹیج پر نمود و نمائش کا موقع۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ موبائل نے جہاں بہت سی آسانیاں پیدا کی ہیں وہیں اس نے عبادت کی روح کو بھی شدید نقصان پہنچایا ہے۔ اب انسان حرم میں بھی تنہا نہیں رہا اس کے ساتھ اس کا کیمرہ، اس کے ناظرین، اس کے سوشل میڈیا اکاؤنٹس اور اس کی مصنوعی دنیا بھی موجود رہتی ہے۔

حرم کی فضا پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ:

اپنے موبائل سے پہلے اپنے دل کو آن کرو!

کیونکہ یہاں تصویروں سے زیادہ کیفیتیں محفوظ کی جاتی ہیں اور اس دربار میں کیمرے نہیں، جھکے ہوئے دل قبولیت پاتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں نگاہوں سے زیادہ آنسو بولتے ہیں اور الفاظ سے زیادہ خموشیاں سنی جاتی ہیں۔ یہاں انسان اگر چند لمحوں کے لیے دنیا سے کٹ جائے تو رب سے اس کا رستہ و تعلق مربوط ہو جاتا ہے۔ مگر افسوس! بعض لوگ حاضری کم دیتے ہیں اور اپنی حاضری کا اعلان زیادہ کرتے ہیں۔

حرم یہ نہیں چاہتا کہ تم صرف منظر قید کرو، حرم یہ چاہتا ہے کہ اس کی ہیبت، اس کی نورانیت اور اس کی روحانیت تمہارے دل میں اتر جائے۔ کیونکہ کعبہ کی اصل زیارت آنکھ سے نہیں، دل سے ہوتی ہے۔

لہٰذا ان مقدس لمحات اور پاکیزہ مقامات پہ اپنے ہاتھوں کو اسکرین پر نہیں، دعا کے لیے اٹھاؤ۔

اپنی نگاہ کو تصویر کی تلاش میں نہیں، طواف کی کیفیت میں گم ہونے دو۔ اور اپنے دل کو اس سکوت سے آشنا کرو جس میں بندہ خود کو دنیا سے دور اور خدا کے بے حد قریب محسوس کرتا ہے۔

شاید اسی لیے اہلِ محبت کہتے تھے:

حرم میں سب سے قیمتی تصویر وہ ہوتی ہے جو انسان اپنے دل پر ثبت کر کے واپس لاتا ہے۔

پیارے! خانۂ کعبہ تصویر لینے کی جگہ نہیں، تصویر بدلنے کی جگہ ہے۔

وہاں کیمرہ نہیں، دل آن ہونا چاہیے۔

وہاں چہرے محفوظ کرنے نہیں، اپنے گناہ مٹانے جاؤ۔

وہاں "اسٹیٹس" لگانے نہیں، اپنا باطن بدلنے جاؤ۔

اگر واقعی سعودی حکومت یا انتظامیہ اس حوالے سے کسی درجے میں سختی اختیار کرتی ہے تو کم از کم اس کے پس منظر میں موجود احساس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ حرم کی عظمت کو بازارِ نمائش بننے سے بچانا بہر حال ایک قابلِ توجہ مقصد ہے۔ البتہ کسی بھی خبر یا اعلان کو بلا تحقیق پھیلانا بھی درست نہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ امت دوبارہ مسجد کے آداب سمجھے، عبادت کی روح محسوس کرے، اخلاص کی حفاظت کرے اور حرمین شریفین کو سوشل میڈیا کے اس شور سے بچائے جو آہستہ آہستہ عبادت کی خاموش لذت کو نگلتا جا رہا ہے۔

ورنہ وہ دن دور نہیں جب لوگ طواف تو کریں گے مگر دل اللہ تعالیٰ کی بجائے کیمرے کی اسکرین پر ہوگا۔ سجدے تو ہوں گے مگر نگاہیں رب کی طرف اٹھنے کی جگہ "ریکارڈنگ" چیک کر رہی ہوں گی۔ اور پھر عبادت باقی رہے گی مگر اس کی روح کہیں پیچھے رہ جائے گی۔

یوں انسان بظاہر عبادت کے اعمال انجام دیتا رہے گا مگر آہستہ آہستہ عبادت کی اصل تاثیر، اس کی باطنی حرارت اور حضوریِ قلب کی وہ دولت کم ہوتی چلی جائے گی جو دراصل حرم کی حقیقی نعمت ہے۔ کیونکہ حرم کا تقدس صرف آنکھ سے دیکھنے کی چیز نہیں، دل سے محسوس کرنے کی کیفیت ہے۔

حرم کی عظمت صرف اس کے سنگ و مرمر، بلند میناروں یا روشن فانوسوں میں نہیں بلکہ اُس کیفیت میں ہے جو وہاں پہنچ کر ایک بندۂ مومن کے دل پر اترتی ہے۔ وہ کیفیت جس میں انسان دنیا سے کٹ کر اپنے رب کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہاں زبان سے زیادہ آنکھیں بولتی ہیں اور الفاظ سے زیادہ خموشیاں دعا بن جاتی ہیں۔ مگر جب یہی خموشیاں موبائل کے شور میں دب جائیں، جب سجدے اخلاص کی بجائے نمائش کا منظر بن جائیں اور جب طواف کی روانی "ریکارڈنگ" کے لیے رکنے لگے، تو سمجھ لینا چاہیے کہ مسئلہ صرف ایک عمل کا نہیں بلکہ احساس کے زوال کا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم دوبارہ مسجد کو مسجد کی طرح دیکھنا سیکھیں، حرم کو صرف پس منظر نہیں بلکہ مرکزِ حضوری سمجھیں اور عبادت دنیا کے روبرو پیش کرنے کی بجائے خدا کو راضی کرنے کا ذریعہ بنائیں۔ کیونکہ جس دن انسان نے عبادت سے تماشے کی آمیزش ختم کر دی، اُسی دن عبادت کی وہ کھوئی ہوئی تاثیر واپس آنا شروع ہو جائے گی جس نے کبھی پتھر دل انسانوں کو بھی رونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ تاثیر جو لفظوں میں نہیں، دل کی گہرائیوں میں اترتی تھی۔ جو خطبوں کے شور سے نہیں بلکہ سجدوں کی خاموشی سے پیدا ہوتی تھی۔ پھر عبادت صرف ایک رسم نہیں رہے گی بلکہ روح کی غذا بن جائے گی۔

قرآن کی تلاوت صرف آواز کا حسن نہیں، دل کے اندر اترنے والی روشنی محسوس ہوگی۔

اذان محض ایک اعلان نہیں رہے گی بلکہ بکھرے ہوئے انسان کو اس کے رب کی طرف بلانے والی ایک زندہ صدا بن جائے گی۔ تب آنکھوں سے بہنے والے آنسو دکھاوے کے نہیں، خشیت کے ہوں گے۔

سجدے عادت کے نہیں، محبت کے ہوں گے اور دعائیں زبان سے کم، ٹوٹے ہوئے دل کی گہرائیوں سے زیادہ نکلا کریں گی۔ پھر شاید مسجدوں کی فضا دوبارہ ویسی ہی ہو جائے جیسی کبھی اللہ والوں کے زمانے میں ہوا کرتی تھی ---- جہاں ایک آیت سن کر دل کانپ اٹھتے تھے، ایک نصیحت پر نگاہیں جھک جاتی تھیں اور رات کی تنہائی میں ایک بندے کی سسکیاں آسمانوں تک سنائی دیتی تھیں۔ کیونکہ عبادت کی اصل قوت ظاہری ہجوم میں نہیں، باطنی اخلاص میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ اور جب دل دوبارہ خدا کی طرف سچے شوق سے پلٹنے لگیں گے تو انسان صرف عبادت کرنے والے نہیں رہیں گے بلکہ عبادت میں ڈھل جانے والے انسان بن جائیں گے۔

حرم کی فضائیں آج بھی وہی ہیں، اذانیں آج بھی وہی ہیں، کعبہ آج بھی اسی جلال کے ساتھ کھڑا ہے بدلا ہے تو صرف انسان کا باطن، اس کی توجہ اور اس کا ذوقِ بندگی۔ اس لیے شاید وقت کی سب سے بڑی پکار یہی ہے کہ اپنے ہاتھوں سے موبائل نیچے رکھو اور اپنے دلوں کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا دو۔ کیونکہ خانۂ کعبہ تصویریں بنانے کی جگہ نہیں، انسان کو بدل دینے کی جگہ ہے اور دل جب اسکرین پر آ جائے تو سجدے زمین پر رہ جاتے ہیں۔

□□□

علم الصیغہ کے دو قاعدے کی تحقیق جدید

مولانا رضوان احمد نوری شریفی
الجامعۃ البرکاتیہ: نوری نگر مانک پور اسنا سورج پور روڈ

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم و علی الہ و أصحابہ و أھل بیتہ أجمعین

قواعد الجمع کی تالیف کا کام تو برسوں پہلے مکمل ہو چکا تھا مگر کوئی نہ کوئی وجہ پیدا ہوتی گئی جس کی وجہ سے کتابت وطباعت میں کافی تاخیر ہوگئی۔ الجامعۃ البرکاتیہ میں طلبہ کو پہلے نحو وصرف کے قواعد پڑھانے کے ساتھ ان کا اجرا کرایا جاتا ہے تاکہ صحیح عبارت خوانی اور عربی بولنا آسانی سے آجائے اسی سلسلہ میں "علم الصیغہ" پڑھانے کا بارہا اتفاق ہوا "علم الصیغہ" چونکہ فارسی زبان میں ہے اور آج کل عموماً طلبہ فارسی سے ناواقف ہوتے ہیں اس لئے کما حقہ سمجھ نہیں پاتے لہذا خیال ہوا کہ قواعد التخفیف والتعلیل کو اردو زبان میں اس انداز سے منتقل کردیا جائے کہ آسانی سے سمجھ لیں لہذا قواعد التخفیف والتعلیل کو لکھنے کے بعد اس کے ساتھ قواعد الجمع" کو بھی کتابت وطباعت کی منزل سے گزار کر منصۂ شہود پر لایا گیا تاکہ خواہشمند طلبہ اس سے کما حقہ فائدہ حاصل کرسکیں۔

صاحب علم الصیغہ، بطل حریت، مجاہد ملت فاضل جلیل عالم نبیل ماہر علوم وفنون حضرت علامہ مولانا مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی علیہ الرحمہ کی وہ بے نظیر کتاب ہے جو علوم صرف کی جامع ہے اور کمال یہ ہے کہ حضرت نے جزیرۂ انڈیمان میں اس حالت میں تصنیف کی جبکہ آپ کے پاس کوئی کتاب موجود نہیں تھی آپ کے ذہن شریف میں اس فن کے متعلق جو باتیں تھیں ان کو صفحۂ قرطاس پر منتقل فرمادیا۔

اعلال وتعلیل کے قواعد میں دو جگہ ایسی ہے جہاں راقم الحروف کو بات سمجھ میں نہیں آتی پہلی جگہ دوسرا قاعدہ ہے جہاں حضرت نے تحریر فرمایا ہے" واو فائی مصدر کہ بر وزن فِعْلٌ باشد بیفتد وعین کسرہ یابد مگر در مفتوح العین گا ہے فتحہ دہند وتاء عوض در آخر بیفزایند چو عِدَةٌ و زِنَةٌ وَسَعَةٌ کہ در اصل وِعْدٌ، وِزْنٌ، وِسْعٌ بود" یہاں حضرت نے عِدَةٌ وزِنَةٌ اور سَعَةٌ کی جو اصل بتائی ہے وہ سمجھ میں نہیں آتی اس لئے خیال ہوا کہ حضرت نے یوں ہی نہیں لکھا ہوگا اور صرفی حضرات نے بھی لکھا ہوگا، تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ صاحب فصول اکبری حضرت علامہ قاضی سید علی اکبر الہ آبادی رحمہ اللہ تعالی نے اس قاعدہ کے تحت صرف اتنا تحریر فرمایا ہے" واو یکہ فائی فعل بود از فعلش افتادہ بیفتد چوں عدۃ" اس عبارت میں لفظ "فعل" کے فا پر کوئی حرکت نہیں دی مگر محشی علامہ مولانا ہادی علی علیہ الرحمہ نے دو جگہ حاشیہ آرائی کی ہے چنانچہ فای فعل پر حاشیہ یوں تحریر فرمایا "اے مصدر مکسور الفا یا فای فعلۃ بالکسر باشد" اور چوں عدۃ پر یوں حاشیہ تحریر فرمایا" عدۃ در اصل وِعْدٌ یا وَعْدٌ است بنا بر قولین حرکت واو بعین دادہ حذف کردند وکسانیکہ اصلش وعد گویند تارا عوض محذوف دانند" حاشیہ کے بارے میں خود محشی

فرماتے ہیں" شروح اور فن کی دیگر مستند کتابوں کی مدد سے ایک عمدہ حاشیہ لکھا اس زمانے میں جس کی مثال ملنا مشکل ہے" ان کتابوں میں مصنف فصول اکبری کی شرح اور شرح شافیہ بھی ہے جس سے معلوم ہوا کہ فعل بکسر الفا مصدر کی قید صرف صاحب علم الصیغہ کے نزدیک نہیں ہے بلکہ دوسرے حضرات نے بھی یہ قید لگائی ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ ارباب علم صرف نے "فِعْل" بکسر الفا مصدر کی قید کس بنیاد پر لگائی جبکہ جو مثالیں پیش کی گئی ہیں یعنی وِزْنٌ، وِعْدٌ، وِسْعٌ وغیرہ ان میں سے کوئی بھی مصدر بکسر الفا مستعمل نہیں ہے راقم الحروف نے قرآن مجید میں ان الفاظ کو دیکھا تو کہیں بھی وِزْنٌ، وِعْدٌ اور وِسْعٌ نہیں ملا بلکہ یہ الفاظ بفتح الفا ملے، وسع اور وھب کا مصدر تو ملا ہی نہیں ہاں وزن اور وعد کا مصدر وَزْن اور وَعْد ملا چنانچہ چند آیات کریمہ کو بطور دلیل پیش کیا جا رہا ہے

(۱) وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ (الأعراف)
(۲) وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ (الرحمٰن)
(۳) فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا (الکہف)
(۴) وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا (النساء)
(۵) إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا (یونس)
(۶) أَلَا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ (یونس)
(۷) وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ (ابراهیم)

اور لغات و معاجم میں مذکورہ الفاظ بکسر الفا نہیں ملے بلکہ سب بفتح الفا ہیں صرف وَسْعٌ فا کی تینوں حرکتوں کے ساتھ ہے لیکن اس کا مصدر نہ ہونا متعین ہے اس لئے کہ وہ طاقت و وسعت کے معنی میں ہے۔ ذیل میں دلیل کے طور پر لغات کی عبارتیں پیش کی جا رہی ہیں۔

(۱) اَلْوَزْنُ کالوعد۔ وَزَنَه يَزِنُه وَزْناً وَزِنَةً (القاموس المحیط)
(۲) وَعَدَه الأمْرَ و بِه يَعِدُ عِدَةً وَ وَعْداً وَ مَوْعِداً وَ مَوْعِدَةً وَ مَوْعُوداً وَمَوْعُوْدَةً (القاموس المحیط ولسان العرب)
(۳) وَسِعَه الشئُ بالکسر يَسَعُه، كَيَضَعُه سَعَةً كَدَعَةٍ وَزِنَةٍ (القاموس المحیط)
(۴) وَهَبَه لَهُ كَوَدَعَه وَهْباً ووَهَباً وَهِبَةً (القاموس المحیط)
(۵) وَزَنَ الْوَزْنُ وَزَنَ الشَّئَ وَزناً وَزِنَةً (لسان العرب)
(۶) السِعَةُ نَقِيضُ الضِيْقِ وَ قَدْ وَسِعَه يَسَعُه وَ يَسِعُه سَعَةً وَ هي قَلِيْلَةٌ (لسان العرب)
(۷) وَهَبَ لَكَ الشَّئ يَهَبُه وَهْباً وَ وَهَباً بالتحريك وَهِبَةً (لسان العرب)
(۸) وَزَنَ الشَّئ - (يَزِنُ) وَزْناً وَزِنَةً (المعجم الوسیط)
(۹) وَسِعَ الشَّئ - (يَسَعُ) سِعَةً (المعجم الوسیط)
(۱۰) وَسِعَ يَسَعُ وَ يَسِعُ سَعَةً وَ سِعَةً (المعجم الوسیط)
(۱۱) (وَعَدَه) الأمر به وَعْداً وَعِدَةً وَ مَوْعِداً وَ مَوْعِدَةً وَ مَوْعُوداً (المعجم الوسیط)
(۱۲) وَعَدَ يَعِدُ وَعْداً وَعِدَةً وَ مَوْعِداً وَ مَوْعِدَةً وَ مَوْعُوداً و مَوْعُوْدَةً (المنجد)
(۱۳) وَهَبَ لَهُ الشَّئ (يَهَبُه) وَهْباً وَوَهَباً وَهِبَةً (المعجم الوسیط)
(۱۴) وَهَبَ يَهَبُ وَهْباً وَ وَهَباً وَهِبَةً (المنجد)
(۱۵) وَزَنَ يَزِنُ وَزْناً وَزِنَةً الشَّئ تولنا (مصباح اللغات)
(۱۶) وَسِعَ يَسَعُ وَ يَسِعُ سَعَةً وَ سِعَةً (مصباح اللغات)
(۱۷) وَعَدَ يَعِدُ وَعْداً وَعِدَةً وَ مَوْعِدَةً وَ مَوْعُوداً وَ مَوْعُوْدَةً (مصباح اللغات)
(۱۸) وَهَبَ يَهَبُ وَهْباً وَ وَهَباً وَهِبَةً (مصباح اللغات)

ان لغات میں کہیں بھی وِزْنٌ، وِسْعٌ، وِعْدٌ اور وِھْبٌ نہیں ہے بلکہ سارے مصادر بفتح الفا یعنی بفتح الواو ہیں

ان کے علاوہ جو افعال مثال واوی ہیں یعنی جن کے فا کلمہ کی جگہ واو ہے ان سب کے مصادر بفتح الفا ہیں اور واو گر کر آخر میں تا

آئی ہے انمیں سے چند افعال اوران کے مصادر کوذیل میں درج کیا جارہاہے تاکہ ناظریں کواطمینان حاصل ہوجائے۔

وَبَصَ یَبِصُ وَبْصاً وَوَبِیْصاً وَبِصَةً، وَثَبَ یَثِبُ وَثْباً وَوُثُوباً وَوَثِیْباً وَثِبَةً، وَثَقَ یَثِقُ ثِقَةً وَوَثُوقاً وَمَوْثِقاً، وَجَبَ یَجِبُ وُجُوباً وَ وَجْباً وَ وَجْبَةً وَجِبَةً، وَجَدَ یَجِدُ وَجْداً وَجِدَةً وَوُجُوداً وَوِجْدَاناً، وَعَظَ یَعِظُ وَعْظاً وَعِظَةً

تعجب یہ ہے کہ جب سارے مصادر مفتوح الفا ہیں تو مکسور الفا کی شرط کیوں لگائی گئی؟ میرے خیال میں سب سے پہلے جنھوں نے یہ قاعدہ بیان کیا انھوں نے غیرارادی طور پر فِعْلٌ لکھ دیا۔ چونکہ وہ معتبر اور قابل بھروسہ شخصیت رہی ہوگی اس لئے بعد کے لوگوں نے فِعْلٌ دیکھ کر مکسور الفا کی قید لگادی اور تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی بہرصورت جو بھی ہو مکسور الفا کی قید صحیح نہیں ہے، صحیح یہ ہے کہ واو فائی مصدر جو فَعْلٌ بفتح الفا کے وزن پر ہوتا ہے وہ گرجاتا ہے اور عین کلمہ مکسور ہوجاتا ہے اور مفتوح العین میں کبھی فتحہ آتا ہے اور آخر میں تائے عوض لائی جاتی ہے اور صاحب علم الصیغہ نے خود الوَعْدُ کی گردان میں وَعْداً لکھا ہے چنانچہ تحریر فرماتے ہیں وَعَدَ یَعِدُ وَعْداً وعِدَۃً الخ

اگر میری باتوں سے ارباب علم ودانش کو اختلاف ہو تو دلائل کی روشنی میں میری تحقیق کو غلط ثابت کردیں تو میں تسلیم کرلوں گا۔

اور دوسرا مقام ۲۶ واں قاعدہ ہے اس میں حضرت نے تحریر فرمایا "واو لام فُعْلی بالضم دراسم جامد یاشود" اس عبارت میں "اسم جامد" میں جامد نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ مثال میں دُنیا اور عُلیا پیش کیا ہے اور یہ دونوں مشتق ہیں جامد نہیں ہیں اگر حضرت نے صرف اسم تحریر فرمایا ہوتا تو صحیح تھا میری بات کی تائید صاحب فصول اکبری کے قول سے بھی ہوتی ہے چنانچہ اسی قاعدہ کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں "فَعلی اسمی یای لامش واوشود نحو تقوی نہ صدیا و فُعْلی اسمی عکس بود چوں دنیا وعلیا نہ غزوی" اس عبارت میں فُعْلی اسمی فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ جو اسم فُعْلی کے وزن پر آتا ہے اس کے لام کلمہ کی جگہ پر واو یا ہوجاتا ہے جیسے دنیا اور علیا میں دنوی اور علوی سے دنیا اور علیا ہوگیا اس لئے اسم کے ساتھ جامد کا لفظ صحیح نہیں ہے۔ لہذا راقم الحروف نے اپنی کتاب میں وہی بات تحریر کی ہے جو تحقیق کے بعد صحیح معلوم ہوئی۔ و صلی الله تعالی علی خیر خلقه و علی آله و أصحابه و أهل بیته أجمعین.

صرفی تحقیق پر اعتراض کا جواب:

اپنی صرفی تحقیق بہت سے ارباب علم ودانش کے پاس بھیجی، ان میں سے ایک صاحب نے میرے پاس اپنی تحریر بھیجی جس میں وِزْنٌ وغیرہ کو صحیح بتایا اور لکھا کہ ارباب لغت تعلیل سے پہلے والی شکل نہیں لکھتے جیسے قَالَ اور بَاعَ تعلیل کے بعد والی شکل ہے اسی طرح زِنَۃٌ وغیرہ تعلیل کے بعد والی شکل لغت میں مذکور ہے۔ اور مفتوح الفا میں کوئی ثقل ہی نہیں کہ حذف وتعوض کی احتیاج ہو۔

اور دُنیا اور عُلیا اسم تفضیل ہیں اور اسم تفضیل جامد ہوتا ہے لہٰذا صاحب علم الصیغہ نے اسم جامد لکھا۔ انکی ساری باتوں کا جواب بھیجا تو اس کا جواب تادم تحریر نہیں آیا۔

اور ایک دوسرے صاحب کو ہمارے حضرت مخدومنا الکریم حضور سید محمد اشرف میاں صاحب قبلہ حفظہ اللہ تعالیٰ وأفاض علینا من برکاتہ نے میری صرفی تحقیق بھیج دی تو انھوں نے بھی موبائل پر انھیں باتوں کا ذکر کیا جن کا اول الذکر نے کیا تھا۔

لہٰذا ان تمام باتوں کا جواب ذیل میں دیا جارہا ہے تاکہ اور کسی کے ذہن میں اس طرح کی بات ہو تو اس کا اشکال اور شک وشبہ دور ہوجائے۔

(۱) لغت میں زِنَۃٌ، عِدَۃٌ اور سِعَۃٌ تعلیل کے بعد والی شکل مذکور ہے اس لئے کہ ارباب لغت تعلیل کے بعد والی شکل کو ذکر کرتے ہیں جیسے قَالَ اور بَاعَ تعلیل کے بعد والی شکل مذکور

ہے تعلیل سے پہلے والی شکل موجود نہیں ہے اس کے جواب میں، میں نے عرض کیا کہ زِنَۃٌ وغیرہ کو قَالَ اور بَاعَ پر قیاس نہیں کیا جائیگا اس لئے کہ ارباب لغت کا طریقہ یہ ہیکہ تمام مصادر کا ذکر کرتے ہیں چنانچہ لغات کی مذکورہ عبارتوں میں دیکھا جا سکتا ہے اور مثال واوی کے جتنے افعال ہیں ان سب کے مصادر میں دونوں شکلیں مذکور ہیں مثلاً وَثَبَ یَثِبُ وَثْباً وَثِبَۃً، وَجَبَ یَجِبُ وَجْباً وَجِبَۃً، وَجَدَ یَجِدُ وَجْداً وَجِدَۃً، وَعَظَ یَعِظُ وَعْظاً وَعِظَۃً وغیرہ میں وَثْباً، وَجْباً، وَجْداً اور وَعظاً میں تعلیل ہوئی تو ثِبَۃً، جِبَۃً، جِدَۃً اور عِظَۃً ہوگیا اور لغت میں دونوں شکلیں مذکور ہیں اگر وِزْنٌ، وِعْدٌ اور وِسْعٌ بکسر الواو مصدر ہوتا تو ضرور ذکر کرتے لہٰذا قول مذکور صحیح نہیں ہے۔

اور اگر فِعْلٌ بکسر الفا والا قاعدہ صحیح مان لیا جائے تو وَثْبٌ، وَجْبٌ، وَجْدٌ اور وَعْظٌ میں تعلیل کیسے کریں گے ان میں تو واو پر کسرہ نہیں ہے تو لامحالہ یہ کہنا ہوگا کہ واو مفتوحہ کو حذف کر کے آخر میں تا لائی گئی ہے اور واو کی حرکت عین کلمہ کو نہیں دی گئی بلکہ عین کلمہ کو کسرہ اس لئے دیا گیا کہ معلوم ہو کہ یہ ضَرَبَ یَضْرِبُ سے آتا ہے اور جو مثال واوی ضَرَبَ اور سَمِعَ دونوں سے آتا ہے تو وہاں عین کو فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے جیسے سَعَۃٌ اور اگر اس کا مضارع صرف مفتوح العین ہوتا ہے تو باب کی موافقت کے لئے عین کلمہ کو کسرہ دیا جاتا ہے جیسے ھِبَۃٌ اس لئے کہ مثال واوی کے تمام افعال تقریباً ضَرَبَ یَضْرِبُ سے آتے ہیں اس لئے قاعدہ میں یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ واو کے کسرہ کو عین کو دیدیا جاتا ہے ورنہ وَجْبٌ وَجْدٌ اور وَعْظٌ میں واو کی حرکت عین کو دیجاتی تو، جَبَۃ، جَدَۃ اور عَظَۃ ہوتا مگر ایسا نہیں ہے بلکہ جِبَۃ، جِدَۃ اور عِظَۃ ہے۔

انہیں دوسرے صاحب سے میں نے یہی بات کہی تو کہنے لگے کہ یہ آپ اپنی طرف سے کہہ رہے ہیں تو میں نے عرض کی کہ ٹھیک ہے میں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوں مگر استعمال اور لغت کی روشنی میں کہہ رہا ہوں چنانچہ القاموس المحیط میں ہے "وَسِعَہُ الشَیَٔ بالکسرۃ یَسَعُہُ کَیَضَعُہُ سَعَۃً کَدَعَۃٍ وَزِنَۃٍ" اور لسان العرب میں ہے "السِعَۃُ نقیض الضیق و قد وَسِعَہُ یَسَعُہُ و یَسِعُہُ سَعَۃً و ھی قلیلۃ" اور المعجم الوسیط میں ہے "وَسِعَ یَسَعُ و یَسِعُ سَعَۃً و سِعَۃً القاموس المحیط میں سَمِعَ سے بیان کیا تو اس کا مصدر بفتح العین لکھا تا کہ پتا چلے کہ اس کا مضارع مفتوح العین ہے اور لسان العرب اور المعجم الوسیط میں ضرب اور سمع دونوں سے بتایا اور مصدر مفتوح العین اور مکسور العین دونوں لکھا تا کہ پتا چلے کہ اس کا مضارع مفتوح العین اور مکسور العین دونوں آتا ہے مگر مکسور العین کا استعمال کم ہے۔

(۲) یہ کہنا کہ مفتوح الفا میں کوئی ثقل ہی نہیں کہ حذف و تعویض کی احتیاج ہو۔ یہ بھی صحیح نہیں اس لئے کہ صرف ثقل کیوجہ سے تعلیل نہیں ہوتی جیسے وَجد وغیرہ سے جِدَۃٌ ہوگیا اگر صرف ثقل کیوجہ سے ہوتی تو دُنیا اور عُلیا کی طرح غُزوی میں بھی واو کو یا سے بدلا جاتا مگر ایسا نہیں ہے۔ میرے قول کی تائید صاحب شرح التصریف علامہ عمر بن ثابت الثمانینی المتوفی ۴۴۲ھ کے قول سے ہورہی ہے چنانچہ تحریر فرماتے ہیں "فأما مصدر ھذا الفعل فان خرج علی أصلہ صحت الواو، لکون الفتحۃ بعدھا علی فَعْلٍ "نحو؛ وَعْدٍ" وَ "وَزْنٍ" یعنی اس فعل کا مصدر اگر اپنی اصل "فَعْلٌ" کے وزن پر نکلے جیسے وَعْدٌ اور وَزْنٌ" تو واو کے بعد فتحہ ہونے کی وجہ سے واو سلامت رہیگا اس کی دو صورت ہے ایک صورت تو یہ ہیکہ جس مصدر میں واو کے بعد فتحہ بھی ہو تو واو سلامت رہیگا جیسے وَھَبَ یَھَبُ وَھَباً وَ وَھْباً میں وَھَباً کا واو سلامت رہیگا اس لئے کہ واو کے بعد فتحہ ہے اور وَھْباً میں واو گر جائیگا اور دوسری صورت یہ ہیکہ مثال واوی کے فعل ماضی میں واو کے بعد فتحہ ہوتا ہے لہٰذا وہ واو ساقط نہیں ہوگا بلکہ سلامت رہیگا جیسے وَعَدَ اور وَزَنَ میں واو

کے بعد فتحہ ہے لہٰذا واو سلامت ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر واو کے بعد فتحہ نہ ہو بلکہ سکون ہو تو واو حذف ہو جاتا ہے اور اس کے عوض میں آخر میں تا آتی ہے جیسے وَعْدٌ سے عِدۃٌ اور وَزْنٌ سے زِنَۃٌ۔ اور محشی و محقق ڈاکٹر ابراہیم بن سلیمان البعیمی خرج علی اُصلہ پر حاشیہ میں فرماتے ہیں "أي جاءَ قياسيا، والثلاثي المتعدي مصدره القياسي "فَعْلٌ"

قال ابن مالک:

فَعْلٌ قياسُ مصدر المعدّی

مِن ذي ثلاثة كَرَدَّ رَدًا

(شرح التصریف صفحہ ۷۷ ۳)

یعنی قیاسی مصدر آئے اور فعل ثلاثی متعدی کا مصدر قیاسی فَعْلٌ کے وزن پر آتا ہے چنانچہ ابن مالک نے اس کو ایک شعر میں بیان کیا کہ ثلاثی سے فعل متعدی کا مصدر فَعْلٌ کے وزن پر آتا ہے جیسے رَدَّ کا مصدر قیاسی رَدًّا ہے۔ الغرض مصنف اور محشی نے واضح طور پر فیصلہ کر دیا کہ وَعَدَ اور وَزَنَ کا قیاسی اور اصلی مصدر وَعْدٌ اور وَزْنٌ ہے اور اسی صفحہ پر عِدۃٌ اور زِنۃٌ کا ذکر کر کے اس کی اصل وِعْدَۃٌ اور وِزْنَۃٌ بتائی جس پر محشی نے تحریر فرمایا کہ اس کی اصل وِعدۃ اور وِزنۃ نہیں ہے اس لئے کہ اس میں عوض اور معوض دونوں کا اجتماع ہے اور یہ جائز نہیں ہے پھر فرمایا "إنما قال المصنف هذا للتعليم فقط" یعنی غیر قیاسی مصدر کا ذکر صرف تعلیم کے لئے ہے یعنی قاعدہ بیان کرنے کے لئے نہیں ذکر کیا گیا ہے اس لئے کہ جو غیر اصلی ہو اس کے پیش نظر کوئی قاعدہ وضع نہیں کیا جاتا۔ اور فَعْلٌ کے وزن پر قیاسی مصدر کی تائید علامہ تفتازانی کی "شرح التصریف" کے قول "واعلم: أن مراد المصنف بقوله (يكون على فعلة) أن يكون مما حذفت الواو من مضارعه" میں "يكون على فعلة" پر محشی کے قول سے بھی ہو رہی ہے چنانچہ محشی فرماتے ہیں، "كذا" في جميع النسخ، مع العلم أن قوله (يكون) ليس من المتن لعل ذكرها سبق قلم أو سهو، والله تعالی اعلم شرح التصریف للتفتازانی صفحہ ۱۵۵

یعنی اسی طرح تمام نسخوں میں ہے حالانکہ یہ معلوم ہے کہ (یکون) علی فِعلۃ متن کا لفظ نہیں ہے شاید یکون علی فعلۃ سبقت قلمی ہے یا سہو ہے۔ پہلی اور بنیادی بات یہ ہے کہ قاعدہ، مستعمل الفاظ و کلمات کی روشنی میں وضع کیا جاتا ہے جب مثال واوی میں کوئی ایسا فعل نظر نہیں آتا جس کے مصدر میں واو کسرہ کے ساتھ ہو اور جب کوئی مصدر بکسر الواو نہیں تو یہ قاعدہ کہاں جاری ہوگا۔

ہاں اگر یہ کہا جائے کہ واو فائے فعل مفتوح ہو تو وہ واو گر جاتا ہے اور اس کے عوض تا آتی ہے تو یہ قاعدہ مثال واوی کے تمام مصادر میں جاری ہوگا اور یہی صحیح ہے۔ واللہ تعالی اعلم

(۳) رہا فُعلی کے وزن پر اسم کا جامد ہونا تو یہ صرف علم الصیغہ میں ہے، نہ ہی شرح التصریف للتفتازانی میں ہے نہ شرح التصریف لعمر بن ثابت میں ہے اور نہ توضیح المقاصد و المسالک بشرح ألفیۃ إبن مالک للمرادی المعروف بابن اُم قاسم المتوفی عام ۷۴۹ھ میں ہے مذکورہ کتابوں میں اسم کا لفظ ہے۔

علم الصیغہ میں اسم تفضیل کو جامد کے حکم میں بتانے سے جامد نہیں ہو جائیگا۔ جامد ہونا اور ہے جامد کے حکم میں ہونا اور ہے۔ چنانچہ تیمم وضو کے حکم میں ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ وضو ہے اگر وضو ہو جاتا تو پانی پر قادر ہونے سے تیمم ٹوٹتا نہیں مثل مشہور ہے آب آمد تیمم برخاست۔

اس لئے اس کے ساتھ جامد کی قید صحیح نہیں ہے۔ سبقت قلمی اور تسامح بھی کوئی چیز ہے بڑے بڑے لوگوں سے تسامح ہوا ہے۔ واللہ تعالی اعلم

موبائل: 9839178545

□□□

درگاہیں: روح کی پناہ گاہیں یا بازار کی رونق؟

مولانا شاہ ریان ابوالعلائی
خانقاہ سجادیہ ابوالعلائیہ، داناپور

دنیا کی تھکی ہوئی روحوں کے لیے درگاہیں ہمیشہ سے ایک ایسا سایہ دار شجر رہی ہیں جہاں محبت، امن اور بھائی چارے کی ٹھنڈی چھاؤں میسر آتی تھی، جب زندگی کے تھپیڑے تھکا دیتے تھے، جب حسرتیں آنکھوں میں تیرتی تھیں اور دل غم کے بوجھ تلے دب جاتا تھا، تب لوگ کسی درگاہ کے آستانے پر سر رکھ کر، اپنی الجھنوں اور دکھوں کا بوجھ ہلکا کرتے تھے۔

دل ہے وہ دل جو تیری یاد سے معمور رہا
سر ہے وہ سر جو تیرے قدموں پہ قربان گیا

دہلی کی پُرشور گلیوں سے گزرتے ہوئے حضرت نظام الدین اولیا کے آستانے پر حاضری دینے والے ہوں یا راجستھان کی تپتی ریت میں سفر کر کے اجمیر شریف پہنچنے والے، ہر ایک کے دل میں یہی امید ہوتی ہے کہ انہیں وہاں وہ پناہ ملے گی جہاں نہ کوئی اونچ نیچ ہو، نہ رنگ و نسل کی دیواریں، نہ قوم و مذہب کی تفریق، درگاہیں اسی مساوات کا مظہر ہوا کرتی تھیں، جہاں دل کی سچائی ہی اصل پہچان تھی۔

بچپن میں ہم نے یہ بات بار ہا سنی کہ ''صوفی گناہ سے نفرت کرتے ہیں، گناہگار سے نہیں'' یہ تعلیم انسان کو سکھاتی ہے کہ اصل چیز ظاہر نہیں بلکہ باطن ہے، آنے والے کی نیت دیکھی جاتی ہے، اس کا خلوص پرکھا جاتا ہے، اس کے اعمال کی قیمت نہیں لگائی جاتی۔ لیکن افسوس! وقت کی گردش نے آج اس نقش کو کچھ دھندلا کر دیا ہے، اب بعض درگاہوں پر روحانیت کی جگہ مادیت نے اپنے خیمے گاڑ دیے ہیں، ایسے کئی واقعات سننے میں آئے ہیں جہاں زائرین، جو دل کی بے قراری لیے فاتحہ پڑھنے جاتے ہیں، تھوڑا وقت گزارنے اور راحت کی سانس لینے جاتے ہیں، انہیں پہلے نذرانہ پیش کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، ڈرایا جاتا ہے، طرح طرح کے وہم و گمان ان کے ذہن میں ڈالے جاتے ہیں اور اگر کسی نے پلٹ کر سوال پوچھ لیا کہ کیا یہ صحیح ہے تو طرح طرح کے حیلے اور بہانے بنانے لگتے ہیں، تاویلات کرنے لگتے ہیں اور پھر درگاہ کے خدام کچھ ایسا کہتے ہیں جس کا مطلب صاف صاف یہ ہوتا ہے کہ ''آپ اگر نذر و نذور پیش نہیں کریں گے تو کوئی خاص توجہ نہیں ملے گی'' اور اگر وہیں کوئی بڑا سرمایہ دار آ جائے تو اس کے لیے خاص اہتمام ہونے لگتا ہے، آستانہ کے اندر سے لوگوں کو نکال کر انہیں خاص طور پر زیارت کرائی جاتی ہے۔

اب وہ مقام جہاں کبھی انسان دوستی کے دریا بہتے تھے، ایسا لگتا ہے جیسے ہر دستک سے پہلے قیمت پوچھی جاتی ہے، جیسے اب دعا کی قبولیت بھی ایک سودا بن چکی ہو۔

کبھی خود پہ کبھی حالات پہ رونا آیا
بات نکلی تو ہر اک بات پہ رونا آیا

اسی طرح اجمیر شریف میں بھی اکثر زائرین کو شکوہ کرتے سنا ہے، ان کا کہنا ہے کہ نماز کے دوران نذر و نذور کا سلسلہ جاری رہتا ہے، ادھر شاہجہانی مسجد میں جماعت کھڑی ہے اور ادھر وہاں کی ٹولی تحفہ و نذور میں مصروف ہیں، منہ میں پان کی گلوری، بدن پر طرح کے مجسمے اور زبان – زبان تو خدا معاف کرے، اتنا بھی پاس و لحاظ نہیں کہ آستانہ کے اندر خاموش رہا جائے، رجسٹر لے کر درگاہ کے دروازہ پر کھڑے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''جنت میں نام

لکھوانا ہو تو کچھ نذر کیجیے“

محبت کے اس مرکز میں اب کہیں کہیں سوداگری کی بازگشت سنائی دیتی ہے اور دل بے اختیار کہتا ہے کہ کہاں وہ درگاہیں جہاں دروازے سب کے لیے کھلے تھے اور کہاں یہ حال کہ ہر قدم پر قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

شرم تو اس وقت مجھے آئی کہ میرے ساتھ جب بعض دوسرے افراد بھی تھے تو اتفاق سے انہوں نے کہا کہ چلیے آج حضرت نظام الدین اؤلیا کی درگاہ پر چلتے ہیں، پہلے کبھی جانا نہیں ہوا، مرکز سے ہی لوٹ جاتے تھے، آج چلا جائے، میں ادھر درگاہ میں وضو بنانے کو گیا اور ادھر ان لوگوں کے ساتھ جو ہوا اس کے بعد میری نظر بھی شرم سے جھک گئی، کہنے لگے ارے میاں! آپ یہاں کیسے آتے ہیں، یہاں تو قدم قدم پر لوگ پریشان کرتے ہیں، سکون کو دو پل بھی یہاں میسر نہیں ہیں۔

میں خود ایک صوفی گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں، خانقاہ سجادیہ ابوالعلائیہ، دانا پور بہار کی سات سو سالہ تاریخ کا ایک ادنیٰ سا فرد ہوں، میرے بزرگ حضرت امام محمد تاج فقیہ، حضرت سیدنا امیر ابوالعلا اور حضرت شاہ اکبر داناپوری وہ ہستیاں ہیں جن کی زندگی کا ہر لمحہ محبت، عاجزی اور خدمت کی خوشبو سے مہک رہا ہے، اسی نسبت سے میں یہ اپنا فرض سمجھتا ہوں ہوں کہ اس حوالے سے کچھ لکھوں، کیوں کہ تصوف تو اپنی ذات کو مٹا دینے کا نام ہے، دوسروں کو عزت دینے کا راستہ ہے، نہ کہ زائرین سے پیسہ اینٹھنے کی چالاکی۔

ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان لوگوں کی ان حرکتوں سے زائرین کس طرح سے غم زدہ ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے درگاہ بدنام ہوتی ہے بلکہ تمام افراد جو تصوف سے وابستہ ہیں وہ شرم سے نظریں نیچے کر لیتے ہیں، یہ زائرین ان خداموں کے رویہ کے بارے میں جب اپنے تاثرات کا اظہار عوام میں کرتے ہیں تو محبانِ خواجہ کو دلی تکلیف ہوتی ہے، یہ خدام لوگ خدارا ہوش کے ناخن لیں اور اپنے رویہ میں مثبت تبدیلی لے آئیں، سوشل میڈیا کا زمانہ ہے اب کسی کو ویڈیو گرافی سے روک نہیں سکتے ہیں، اگر آپ سچے خادم ہیں تو خواجگانِ چشت کے اخلاق کو اپنی ذات میں اتاریں اور زائرین کو خوش رکھیں ان کو اپنے اعتبار سے درگاہ میں اپنی خراج عقیدت پیش کرنے کا مناسب موقع دیں۔

دوسرے شہر سے ایک فیملی آئی اور پریشانی کے عالم میں اس نے حاضری دی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہیں اس کی پریشانی کا فائدہ اٹھا کر اسے ڈرا دیا گیا، بے چارہ مرتا کیا نہ کرتا، اس نے روتے بلکتے اپنی جان کی قیمت سمجھ کر ادا کردی، ہاں! اگر کوئی خوشی سے دے تو یہ اور بات ہے، کیا لکھوں اور کیا چھوڑوں ہر ایک لفظ نشتر بن کر چبھ رہا ہے۔

پرانے خدام کا حال کچھ اور ہی تھا، وہ اگر دیکھتے کہ کوئی زائر تہی دست ہے تو اپنی جیب سے اس کی مدد کرتے، راستہ دکھاتے، کھانے اور رہنے کا بندوبست کرتے، نرمی سے پیش آتے، ان کے نزدیک درگاہ کی خدمت ایک عبادت تھی، نہ کہ تجارت۔ لیکن آج جب بعض درگاہوں پر پیسے کی طلب نے خلوص کو زنگ آلود کردیا ہے تو یہ منظر دیکھ کر دل سے بے ساختہ آہ نکلتی ہے، کچھ لوگ تو یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ ہم اپنی مسجدوں میں، اپنے مراکز میں ہی اچھے ہیں، جہاں دعا مانگنے پر کوئی قیمت نہیں لگائی جاتی۔

تاہم یہ بھی سچ ہے کہ آج بھی کچھ خدام ایسے ہیں جو اپنے بزرگوں کی روش پر قائم ہیں، وہ محبت سے پیش آتے ہیں، زائرین کا خیال رکھتے ہیں جیسا کہ ایک صاحب نے بتایا کہ ایک مرتبہ میں حضرت نظام الدین اؤلیا میں افطار کے وقت پہنچا اور جگہ نہ ملنے کی وجہ سے سیڑھیوں پر بیٹھ گیا، اتفاق سے ایک امام صاحب کی نظر مجھ پر پڑھی فوراً انہوں نے مجھے اپنے پاس بلا کر افطار کرایا اور عزت دی۔ یہ منظر دیکھ کر امید کی ایک کرن دل میں جاگ اٹھی۔

سو یہ کہنا بجا ہوگا کہ اگرچہ درگاہوں پر زمانے کی گرد جم گئی ہے مگر ہر درگاہ میں کچھ چراغ ابھی بھی روشن ہیں جو محبت کی روشنی کو زندہ رکھے ہوئے ہیں، ہمیں امید ہے کہ وہ تمام افراد جو مادیت کی راہ اختیار کر چکے ہیں وہ خواجہ معین الدین چشتی اور حضرت نظام الدین اؤلیا کی تعلیمات کی طرف متوجہ ہوں گے، اتنی عظیم ہستیوں کی بارگاہ میں خدمت کرنے والے یہ خدام کب مشائخ کی طرز کو اپنائیں گے؟

میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

□□□

سوشل میڈیا کا درپن

■ مولانا غلام مصطفےٰ نعیمی ■ مولانا انیس الرحمٰن رضوی ■ احمد رضا صابری ■ محمد ریحان رضا

قمر عثمانی: ناموس رسالت کا وہ محافظ جو ہماری توجہ چاہتا ہے

مولانا غلام مصطفےٰ نعیمی: ایڈیٹر''السواد الاعظم دہلی۔ ورکن روشن مستقبل دہلی

ناموس رسالت ہمیشہ سے غیرت مند اہل ایمان کے لیے بڑا اہم نظریہ رہا ہے۔ عہد رسالت سے لیکر عہد حاضر تک ہر صاحب ایمان نبی کریم ﷺ کی عزت وناموس کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہے۔ اس حوالے سے دور حاضر میں محترم قمر غنی عثمانی صاحب نے جمہوری حقوق اور قانونی دائرہ میں رہتے ہوئے شاتمان رسول کے خلاف مہم شروع کی تھی۔ لیکن سازشوں کا شکار ہوکر انہیں پابند سلاسل ہونا پڑا۔ قریب چار سال سے عثمانی صاحب گجرات کی سابرمتی جیل میں بند ہیں۔ تمام تر کوششوں کے باوجود کیس کی شنوائی صحیح سے آگے بڑھ پائی ہے اور نہ ضمانت مل سکی ہے۔ اس حوالے سے یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ جماعتی سطح پر عثمانی صاحب یا دیگر محافظین ناموس رسالت کو ویسی توجہ نہیں دی گئی، جس کے وہ حق دار ہیں۔

قمر غنی عثمانی جماعت اہل سنت کا وہ چہرہ ہیں جنہوں نے تحفظ ناموس رسالت کا نعرہ اس وقت بلند کیا جب اس عنوان پر بات کرنے کا عمومی مزاج نہیں تھا۔ وہ قمر عثمانی ہی تھے جنہوں نے ناموس رسالت کے نام پر گرفتار کئے گیے مسلم نوجوانوں کے مقدمات لڑنے کا حوصلہ دکھایا۔ اب تک ان جیسے کاموں کے لیے جمعیۃ علماے ہند ہی مشہور تھی۔ افراد اہل سنت اکثر اس کا شکوہ کرتے تھے کہ کاش ہماری بھی ایسی تحریک ہوتی جو مظلوموں کی حمایت میں سڑک سے کورٹ تک کھڑی ہوتی، اس وقت قمر عثمانی نے جمود کو توڑا اور اپنی بساط سے بڑھ کر اہل سنت کی نمائندگی کی۔ انہوں نے مختصر سے وقت میں تقریباً آدھا درجن مقدمات کی پیروی کا ذمہ اٹھایا۔ سوشل میڈیا پر شان رسالت مآب میں ہونے والی گستاخیوں کے خلاف ایک ٹیم بنائی جو ایسے اکاؤنٹس اور افراد کی گستاخیوں کے خلاف آنلائن پولیس کمپلین کرتی تھی۔ انہوں نے زمینی سطح پر درجنوں شہروں میں ایسے افراد تیار کردئے تھے جو کسی بھی معاملے پر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ انہوں نے لاک ڈاؤن کے پہلے مرحلے میں جب کورونا پابندیوں کی بنیاد پر مختلف مسجدوں سے اماموں کو ہٹا دیا گیا یا تنخواہیں بند کر دی گئیں ایسے مشکل وقت میں قمر عثمانی ہی تھے جنہوں نے آگے بڑھ کر سیکڑوں ائمہ کو سامان ضرورت کے لیے ٹھیک ٹھاک اماؤنٹ ٹرانسفر کرایا۔ یہ قمر عثمانی ہی کا حوصلہ تھا کہ کشمیر سے تریپورہ تک انہوں نے اہل سنت کی نمائندگی کا کام انجام دیا۔ عثمانی صاحب کی سب سے بڑی خاصیت یہ تھی کہ وہ گفتار کے نہیں کردار کے غازی تھے۔ ان کا کام زمینی سطح کا تھا۔ اچھے، ذی استعداد اور متحرک علما کو تلاشنا اور ان سے استعداد کے مطابق خدمات لینے کا مزاج تھا۔ انہوں نے زمینی سطح پر ایسے افراد تیار کرنا شروع کردئے تھے جو قومی مسائل پر جرأت ایمانی

کے ساتھ کسی بھی صورت حال کو فیس کرنے کا مادہ رکھتے تھے۔ عثمانی صاحب قدرے جذباتی ضرور تھے مگر یہ جذبات بھی مومنانہ غیرت کی بنیاد پر ہوتے تھے چند ایک معاملات کو چھوڑ دیں تو ان کے زیادہ تر کام غور وخوض اور استصواب رائے کے بعد ہی انجام پاتے تھے۔

چار سال پہلے گجرات میں ہوئے ایک قتل میں انہیں ملزم بنا کر پابند سلاسل کر دیا گیا، حالانکہ ان کا اس قتل میں کوئی رول نہیں تھا۔ تب سے لیکر آج تک وہ جرأت وہمت کے ساتھ قید کی صعوبتیں اٹھا رہے ہیں لیکن ان کے پاؤں میں ادنی سی بھی لغزش نہیں آئی ہے۔ اس درمیان خانگی سطح پر انہیں بڑی تکلیفوں کا بوجھ اٹھانا پڑا۔ دو چھوٹے بچے باپ کی شفقت سے محروم ہو گیے لیکن ابھی تک باپ کا چہرہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ بوڑھی ماں چار سال سے اپنے جواں سال بیٹے کی راہ دیکھ رہی ہے۔ تمامی احباب اہل سنت/مشائخ کرام/علماے کرام/ائمہ کرام اور اہل قلم سے گزارش ہے کہ وہ اپنی حمایت اور مطالبات میں حضرت قمر عثمانی صاحب کو یاد رکھیں۔ ان کی رہائی کی کوششیں کریں کہ ان کے جیسے متحرک وفعال انسان کی رہائی سے تحریکی وتنظیمی کاموں میں تیزی آئے گی۔

یاد رکھیں! طریقہ کار اور رائے کے اختلاف کی بنیاد پر اپنوں کو اکیلا چھوڑ دینا کہیں نہ کہیں خود کو جماعتی سطح پر کمزور ہی کرنا ہے اس لیے اپنے نمائندہ افراد کا دل وجان سے ساتھ دیں اور ان کی رہائی کی ہر ممکن کوشش کریں تا کہ ہمارے دینی وجمہوری حقوق کو کوئی پامال نہ کر سکے۔

□□□

اسٹیج کی چکاچوند میں بکتا ہوا دین

■ مولانا انیس الرحمن حنفی رضوی بہرائچ شریف
پرنسپل جامعہ رضویہ زینت العلوم، سرس کھیڑا ضلع مرادآباد یوپی

اسلام ایک مقدس امانت ہے، اور اس امانت کو نسل در نسل منتقل کرنے کی ذمہ داری ان نفوسِ قدسیہ نے انجام دی جنھوں نے اپنی زندگیاں علم، عمل، تقویٰ، اخلاص اور دعوتِ حق کے لیے وقف کر دیں۔ انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد علماءِ حق نے ہمیشہ امت کی رہنمائی کی، لوگوں کے عقائد کی حفاظت کی، اور دین کو بازار کی جنس بننے سے بچایا۔ مگر تاریخ کا یہ المیہ بھی کم دردناک نہیں کہ ہر دور میں کچھ ایسے عناصر پیدا ہوتے رہے جنھوں نے مذہب کے مقدس نام کو اپنی دنیاوی اغراض، ذاتی شہرت، مالی مفادات اور وقتی اقتدار کے لیے استعمال کیا۔

آج کا دور سوشل میڈیا، نمائش، مصنوعی شہرت اور جذباتی استحصال کا دور ہے۔ ہر میدان میں اصل اور نقل، خلوص اور ریا، دعوت اور تجارت، اصلاح اور تماشے کے درمیان فرق مٹتا جا رہا ہے۔ یہی صورتِ حال دینی جلسوں اور مذہبی اجتماعات میں بھی شدت کے ساتھ دکھائی دے رہی ہے۔ کبھی یہ جلسے اصلاحِ معاشرہ، بیداریٔ ملت، تعلیمِ دین اور عوام کی فکری تربیت کا ذریعہ ہوتے تھے، مگر آج ان میں سے ایک بڑی تعداد محض "ایونٹ" بن کر رہ گئی ہے، جہاں علم کی جگہ شور، اخلاص کی جگہ کاروبار، اصلاح کی جگہ تفریح، اور دعوت کی جگہ شخصیت پرستی نے لے لی ہے۔

پیشہ ور مقرروں، نعت فروش شاعروں، دروغ گو ناؤنسرز اور خلافِ شرع پیرانِ کرام کے نام پر کاروبار کرنے والوں نے دین کو ایک ایسی منڈی میں تبدیل کر دیا ہے جہاں آوازوں کی بولی لگتی ہے، شہرت خریدی جاتی ہے، عقیدت فروخت ہوتی ہے، اور عوام کے جذبات کو نوٹوں میں تولا جاتا ہے۔ ان کے گرد کچھ ایسے جاہل منتظمین اور جلسہ باز افراد جمع ہو گئے ہیں جن کا مقصد نہ دین کی خدمت ہے، نہ قوم کی اصلاح، نہ علم کی اشاعت؛ بلکہ ان کی پوری جدوجہد صرف اس بات پر مرکوز ہوتی ہے کہ کس مقرر کی "مارکیٹ" زیادہ گرم ہے، کون زیادہ مجمع کھینچ سکتا ہے، کس کی آواز پر عوام زیادہ نوٹ نچھاور کرتے ہیں، اور کون سوشل میڈیا پر زیادہ "وائرل" ہو سکتا ہے۔

افسوس کا مقام یہ ہے کہ دین کے نام پر ہونے والی اس تجارت میں نہ صرف عوام کا مال لوٹا جا رہا ہے بلکہ دین کی عزت، علماء کی

وقعت اور مذہبی اجتماعات کی روح بھی مجروح ہو رہی ہے۔ جلسوں کے بعد رقم کی تقسیم پر جھگڑے، گالی گلوچ، ایک دوسرے کی کردار کشی، سازشیں، دھوکہ دہی، خفیہ کمیشن، اور باہمی دشمنیاں اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہیں۔ پہلے یہ سب کچھ چند بستیوں اور مخصوص حلقوں تک محدود تھا، مگر اب سوشل میڈیا نے ان سب کے چہروں سے نقاب نوچ لیا ہے۔ آج عوام اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اسٹیج پر عشقِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے نعرے لگانے والے پسِ پردہ کس طرح دولت، شہرت اور مفاد کی جنگ لڑتے ہیں۔

یہ حقیقت بھی نہایت تلخ ہے کہ بہت سے جلسے اب اصلاحی مراکز نہیں بلکہ جذباتی سرکس بن چکے ہیں، جہاں سامعین کی دینی تربیت کے بجائے ان کی وقتی جذباتیت کو بھڑکایا جاتا ہے۔ کہیں جھوٹے خواب سنائے جاتے ہیں، کہیں من گھڑت کرامات، کہیں بے سند واقعات، کہیں مخالفین پر بازاری حملے، کہیں مصنوعی رقت آمیز آوازیں، کہیں عقیدت کے نام پر شرکیہ انداز، اور کہیں دین کے نام پر چندہ خوری کا منظم کاروبار۔ مقرر بول رہا ہوتا ہے مگر مقصد اصلاح نہیں بلکہ اپنی "برانڈنگ" ہوتی ہے؛ شاعر نعت پڑھ رہا ہوتا ہے مگر اس کے پیشِ نظر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سے زیادہ اپنی بکنگ اور معاوضہ ہوتا ہے؛ اناؤنسر عوام کو جوش دلا رہا ہوتا ہے مگر درحقیقت وہ جذبات کو نقدی میں تبدیل کرنے کی مہارت دکھا رہا ہوتا ہے۔

یہ صورتِ حال صرف چند افراد کا انفرادی فساد نہیں بلکہ پورے دینی ماحول کے لیے ایک خطرناک بحران ہے۔ جب دین کا تعلق اخلاص کے بجائے کاروبار سے جڑ جائے، جب علم کے بجائے اداکاری کو ترجیح ملنے لگے، جب تقویٰ کے بجائے شہرت معیار بن جائے، اور جب عوام کے جذبات کو لوٹنا "فن" سمجھا جانے لگے، تو پھر ایسے ماحول میں حقیقی علماء، مخلص داعیانِ دین اور خاموش خدمت گزار افراد پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قوم کی فکری بنیادیں کمزور ہوتی ہیں، عوام دین سے بدظن ہوتے ہیں، اور نوجوان مذہبی طبقے کو ایک تماشائی گروہ سمجھنے لگتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے دعوت و تبلیغ کو کبھی تجارت نہیں بنایا۔ اکابر علماء اور اولیاء نے ہمیشہ قناعت، سادگی، اخلاص اور بے نفسی کے ساتھ دین کی خدمت کی۔ ان کی مجلسوں میں علم ہوتا تھا، کردار ہوتا تھا، اصلاح ہوتی تھی، خوفِ خدا ہوتا تھا؛ نہ کہ مصنوعی شور، ذاتی تشہیر اور دولت کی ہوس۔ آج اگر مذہبی جلسے اپنی اصل روح کھو چکے ہیں تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ اخلاص کی جگہ مفاد نے لے لی ہے۔

لہٰذا وقت کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ ملت ان پیشہ ور دین فروشوں کے فریب کو سمجھے، جلسوں کو تجارت بننے سے بچائے، اور دین کے نام پر ہونے والی اس لوٹ کھسوٹ کے خلاف سنجیدہ اصلاحی آواز بلند کرے۔ عوام کو چاہیے کہ وہ جذباتی نعروں اور مصنوعی خطابت کے بجائے علم، کردار، دیانت اور اخلاص کو معیار بنائیں۔ ہر بستی میں درجنوں نام نہاد "اسٹار مقرروں" کو بلانے کے بجائے اپنے علاقے کے کسی مستند، باعمل اور مخلص عالمِ دین کو عزت کے ساتھ بلائیں، مختصر مگر علمی و اصلاحی نشست منعقد کریں، تاکہ جلسے پھر سے اصلاحِ امت کا ذریعہ بن سکیں، نہ کہ دین کے نام پر دنیا کمانے والوں کی کمائی کا بازار۔

کیونکہ جب دین اسٹیج کی چکاچوند سے نکل کر اخلاص کی روشنی میں واپس آئے گا، تبھی امت کی اصلاح ممکن ہوگی۔ ورنہ وہ دن دور نہیں جب عوام مذہبی اجتماعات کو عبادت نہیں بلکہ ایک کاروباری تماشا سمجھنے لگیں گے، اور یہ المیہ صرف چند افراد کا نہیں بلکہ پوری ملت کے زوال کا عنوان بن جائے گا۔

□□□

جب عوام کا ووٹ اقتدار سے زیادہ طاقتور تھا۔۔!!

احمد رضا صابری
ڈائریکٹر احمد اپبلیکیشنز (پرائیویٹ لمیٹڈ) پٹنہ

مسلہ یہاں کسی پارٹی کی جیت یا ہار کا نہیں ہے، نہ ہی کسی لیڈر کی حمایت یا مخالفت کا۔ اصل سوال صرف اتنا ہے کہ کیا اقتدار کی

ہوس میں جمہوریت کی روح کو کچل دینا درست ہے؟

اگر آج اندھ بھکت صرف اس لیے خاموش ہیں کہ ان کی پسند کی حکومت اقتدار میں ہے، تو یاد رکھیے...... وہ اپنے ہی بچوں کے قدموں تلے وہ زمین کھود رہے ہیں جہاں کل نہ ان کے پاس کوئی حق بچے گا، نہ آواز، نہ انصاف اور نہ امید۔

آج جو کچھ ہو رہا ہے، وہ محض سیاست نہیں ہے...... چند لوگوں کا تقریباً پورے نظام پر قبضہ ہو چکا ہے۔ آئینی ادارے، تفتیشی ایجنسیاں، عدالتی نظام، میڈیا، سیکورٹی فورسز سب کو اقتدار کی ڈھال اور ہتھیار میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔

اور سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ اس سب کو "قومی مفاد"، "دھرم"، "قوم پرستی" اور "مضبوط قیادت" کے نام پر جائز قرار دیا جا رہا ہے۔

آج شاید بھکتوں کو وقتی سرور حاصل ہو رہا ہو، لیکن یاد رکھو، اقتدار نہ ہمیشہ رہتا ہے اور نہ اقتدار پر بیٹھا کوئی شخص ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

آج یہ نام نہاد "وشوگرو" اور اس کے حواری اپنی اقتدار کی بے لگام ہوس میں اداروں اور نظام کو تباہ کر رہے ہیں۔ کل اگر کوئی مخالف قوت اقتدار میں آئی تو یہی تمام بداعمالیاں اسے ورثے میں ملیں گی، پورا تیار شدہ نظام اس کے ہاتھ میں ہوگا۔ پھر کس منہ سے احتجاج کرو گے؟ پھر تمہاری سنے گا کون؟ پھر اپنے بچوں کو کس ملک میں بھگاؤ گے؟

اگر اقتدار کی اندھی بھوک میں اداروں کو ہی تباہ کر دیا گیا، تو آنے والی ہر حکومت اسی سڑے ہوئے نظام کو استعمال کرے گی۔ پھر جمہوریت صرف کتابوں میں رہ جائے گی، زمین پر نہیں۔

آج عوام کے بنیادی مسائل، بے روزگاری، مہنگائی، تعلیم، صحت، کسان، نوجوان اور چھوٹے تاجر سب کو پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔

کیوں؟ کیونکہ اقتدار کو یقین ہو چکا ہے کہ نظام ان کے قبضے میں ہے، اور عوام کو مذہب اور ذات پات کی افیون دے کر ہمیشہ تقسیم رکھا جا سکتا ہے۔

جمہوریت کی سب سے بڑی طاقت کیا تھی؟ عوام کا اعتماد!

یہ یقین کہ انتخابات منصفانہ ہوں گے، ووٹ محفوظ رہے گا، ادارے اقتدار کے غلام نہیں بنیں گے، اور آخر کار عوام ہی اصل مالک ہوں گے۔

لیکن آج یہی اعتماد ٹوٹنے لگا ہے۔ جب الیکشن کمیشن پر سوال اٹھنے لگیں، جب عدالتی نظام پر بھروسہ متزلزل ہونے لگے، جب میڈیا اقتدار کی گود میں بیٹھ جائے، تو سمجھ لو کہ جمہوریت اندر سے کھوکھلی ہونے لگی ہے۔

سب سے خوفناک بات یہ نہیں کہ اقتدار آمرانہ ہو گیا ہے...... سب سے خوفناک بات یہ ہے کہ عوام کو اس کی عادت پڑتی جا رہی ہے۔

یاد کریں 2012-13 کا وہ عوامی غصہ۔ عوام نے 2014 میں ووٹ کے ذریعے حکومت بدل دی تھی۔ یہی جمہوریت کا حسن تھا۔

لیکن ذرا سوچیں، اگر اُس وقت بھی حکومت انتخابی نظام، میڈیا، ایجنسیوں اور اداروں کو مکمل طور پر اپنے قبضے میں لے لیتی، تو کیا اقتدار کی تبدیلی ممکن ہوتی؟

ہمارا جمہوری نظام اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود اس لیے مضبوط تھا، کیونکہ عوام کو یقین تھا کہ ان کا ووٹ اقتدار سے زیادہ طاقتور ہے۔

آج یہی یقین ٹوٹنے لگا ہے۔ اور جس دن عوام کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ان کا ووٹ بے معنی ہے، اُس دن جمہوریت صرف ایک دکھاوا بن کر رہ جائے گی۔

ہمارے مجاہدینِ آزادی، انقلابیوں اور لاکھوں لوگوں نے اپنا خون اس لیے نہیں بہایا تھا کہ آنے والی نسلیں خوف اور پروپیگنڈے کے سہارے چلنے والے نظام میں زندگی گزاریں۔

انہوں نے ہمیں صرف آزادی نہیں دی تھی، بلکہ یہ حق بھی دیا تھا کہ ہم سوال کریں، حکومت بدلیں، اور اقتدار کو جواب دہ بنائیں۔

اگر یہی حق آہستہ آہستہ ہم سے چھین لیا جائے، تو پھر ہمارے پاس بچے گا کیا؟

ایک ایسا ملک، جہاں انتخابات تو ہوں گے مگر انتخاب جیسی کوئی حقیقت نہیں ہوگی۔ جہاں اپوزیشن تو ہوگی مگر اس کے پاس کوئی طاقت نہیں ہوگی۔ جہاں میڈیا تو ہوگا مگر سچ نہیں ہوگا۔ جہاں آئین تو ہوگا مگر اس کی روح مر چکی ہوگی۔

جمہوریت ایک دن میں نہیں مرتی...... اسے آہستہ آہستہ عادتوں، اندھی عقیدت، خوف اور خاموشی کے ذریعے قتل کیا جاتا ہے۔ اور سب سے پہلے مرتی ہے عوام کی سوچ۔

اس لیے ابھی بھی وقت ہے۔ پارٹیوں سے اوپر اٹھ کر سوچیں۔ لیڈروں سے اوپر اٹھ کر سوچیں۔ اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے سوچیں۔

کیونکہ جس دن جمہوریت واقعی ختم ہوگئی، اُس دن نہ ہماری آواز سنی جائے گی، نہ تمہارا احتجاج کوئی معنی رکھے گا، اور نہ ہی آنے والی نسلیں ہمیں معاف کریں گی۔

جمہوریت صرف آئین کی کتاب میں لکھی ہوئی دفعات سے زندہ نہیں رہتی...... وہ زندہ رہتی ہے باشعور شہریوں سے۔

اور اگر شہری ہی اندھی عقیدت میں سو جائیں، تو پھر جمہوریت کو مرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

□□□

کاکروچ جنتا پارٹی: ایک غیر روایتی طنزیہ سوشل میڈیا پلیٹ فارم

■ محمد ریحان رضا، بنارس

"کاکروچ جنتا پارٹی" (CJP-Cockroach Janta Party) بھارت میں ابھرتا ہوا ایک غیر روایتی، طنزیہ اور سوشل میڈیا پر مبنی عوامی پلیٹ فارم ہے، جو خاص طور پر نوجوان نسل یعنی Gen Z کے جذبات، مایوسیوں اور سیاسی و سماجی ناراضگی کی نمائندگی کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ یہ کوئی باقاعدہ انتخابی سیاسی جماعت نہیں، بلکہ ایک ڈیجیٹل مومنٹ کی شکل اختیار کر چکا ہے، جس نے بہت کم وقت میں حیرت انگیز مقبولیت حاصل کر لی۔

اس تحریک کی شروعات ایک طنزیہ انداز سے ہوئی، جب سوشل میڈیا پر "کاکروچ" کی علامت کو عام آدمی کی مشکلات، بے بسی اور حکومتی بے توجہی کے استعارے کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ نوجوانوں نے اسے فوراً ہاتھوں ہاتھ لیا اور یہ دیکھتے ہی دیکھتے احتجاج، مزاح، طنز اور عوامی غصے کی مشترکہ علامت بن گیا۔

"کاکروچ جنتا پارٹی" کے وائرل ہونے کی سب سے بڑی وجہ بھارت میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری، امتحانی پیپر لیک، مہنگائی، تعلیمی بحران، سسٹم سے ناراضگی اور سیاسی ماحول سے نوجوانوں کی مایوسی کو مانا جا رہا ہے۔ سوشل میڈیا پر اس پلیٹ فارم نے میمز، طنزیہ ویڈیوز، عوامی تبصروں اور جذباتی پوسٹس کے ذریعے لاکھوں نوجوانوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

یہ ٹرینڈ اس وقت زبردست وائرل ہوا جب ایک جج کے "کاکروچ" والے بیان کے بعد نوجوانوں نے اسے احتجاجی علامت بنا لیا۔ مزاحیہ میمز، حکومت مخالف طنز، Gen Z کی ناراضگی اور انسٹاگرام پر تیز رفتار شیئرنگ نے اسے چند دنوں میں 22 ملین سے زیادہ فالورز تک پہنچا دیا۔

صرف چند دنوں میں انسٹاگرام پر اس کے کروڑوں فالورز بن جانا اس بات کی علامت ہے کہ بھارتی نوجوان روایتی سیاست سے ہٹ کر ایسے پلیٹ فارمز کی طرف توجہ دے رہے ہیں، جہاں ان کی آواز، غصہ اور احساسات کھل کر سامنے آسکیں۔ یہی وجہ ہے کہ "کاکروچ جنتا پارٹی" اب صرف ایک مذاق یا میم نہیں رہی، بلکہ سوشل میڈیا پر ایک طاقتور عوامی رجحان اور نوجوانوں کی نفسیاتی کیفیت کی علامت بنتی جا رہی ہے۔

□□□

امام احمد رضا کے حاسدین کی خدمت میں

مولانا حماد رضا قادری: مہتمم جامعہ حضرت فاطمہ پٹنہ

ہندوستان کی سرزمین بڑی زرخیز ہے۔ یہاں سے علم ادب معرفت سائنس ہرفن کے ماہرین پیدا ہوئے ہیں۔ مذہبی دنیا کے نامور علما وعرفا سلاسل اربعہ قادریہ چشتیہ سہروردیہ نقشبندیہ کے اکابر صوفیہ بھی اس سرزمین میں خوب خوب پیدا ہوئے، جن کی خدمات کی خوشبو سے پورا ملک معطر ہے۔ عطائے رسول سیدنا خواجہ غریب نواز رضی اللہ تعالیٰ کو سلطان الہند کہا گیا اور اس لئے کہا گیا کہ اس کے پیچھے ان کی تبلیغ ورشد وہدایت سے لاکھوں انسانوں کے مسلمان ہونے کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ بعد کے بزرگوں نے اسی سلسلہ کو آگے بڑھا اور یوں لاکھوں سے کڑوروں انسان دولت ایمان سے مشرف ہوئے۔ پھر اسی ملک میں اسلام کے خلاف بعض فتنوں نے جنم لیا جسے اپنے اپنے دور کے اولیا علما اور مجددین نے ختم کیا۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ بھی انہیں علما وصوفیہ میں سے ہیں جنہوں نے زندگی کا لمحہ لمحہ دین کی خدمت اور حفظ ناموس رسالت میں صرف کیا۔ دین کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کے استیصال کے لئے مجددانہ شان کے ساتھ عملی میدان میں آئے اور دین پر آئے گرد وغبار کو صاف کر کے پھر اس کا چہرہ صاف وشفاف کردیا۔ یہ اعتراف عرب وعجم کے علما وشیوخ طریقت نے کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ صاحب نعمت محسود ہوتا ہے، اس سے حسد کرنے والے پیدا ہوجاتے ہیں۔ اس لئے جہاں ان کے مقام ومرتبہ کے جاننے والے حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں وہیں بعض لوگ اپنی کم نگاہی اور کور باطنی سے ان کی عیب جوئی میں لگے رہتے ہیں۔ امام احمد رضا قدس سرہ بھی ان ہی صاحبان علم ومعرفت کے بطل عظیم ہیں جن کے ماننے والے، ان کی علمی، فنی، مذہبی، ملی خدمات کا اعتراف کرنے والے اور ان کی شان معرفت کا برملا اظہار کرنے والے پوری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف کچھ لوگ ان سے حسد میں جل بھن کر خاک ہوجانے والے بھی مل جاتے ہیں۔ انہیں صرف یہ غم ستاتا ہے کہ ان کی یاد میں سیمینار و کانفرنس کیوں ہوتے ہیں، لاکھوں مدارس ان کے نام پر کیوں ہیں؟ ان کا عرس کیوں منایا جاتا ہے؟ ان کی خدمات پر کتابیں کیوں لکھی جاتی ہیں؟ ان پر اب تک پوری دنیا کی یونیورسیٹی میں ۵۲ رسے زاید پی ایچ ڈی کیسے ہوگئی؟ اب ان جلنے بھننے والوں کو اس کے سوا کیا کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ جس سے راضی ہوتا ہے اس کی محبت لوگوں کے دلوں میں پیدا فرما دیتا ہے۔ اگر تمھارے گھر کے لوگوں کو بدعقیدگی کے سبب لوگوں نے ٹھکرا دیا ہے تو قصور تمہارا ہے۔ اعلیٰ حضرت کا تمہاری محرومی سے کیا تعلق ہے؟

ابھی پندار اخبار میں ایک مضمون ''تونے اسلام کو کیا کھیل سمجھ رکھا ہے'' کے عنوان سے پڑھنے کو ملا۔ اس مضمون میں جس طرح

اہل سنت و جماعت کے ساتھ گستاخانہ زبان استعمال کی گئی ہے وہ بیان سے باہر ہے، مگر اسی تناظر میں قارئین کا ذہن صاف کرنے کے لئے بعض مخلص احباب کے اصرار پر یہ مضمون میں بھی لکھ رہا ہوں۔ مضمون سے یہ ساف اندازہ ہوتا ہے کہ بے چارے مضمون نگار کو دو چار باتوں کے علاوہ اور کچھ معلوم ہی نہیں ہے اور مضمون نگار ہی کیا، ان کی پوری برادری بدعت بدعت اور شرک شرک کہتے کہتے قبر تک پہنچ جاتی ہے، اس کے سوا کوئی کچھ اور کہنے کو تیار ہی نہیں ہوتا اور ہو بھی کیسے کہ ان لوگوں نے پوری زندگی اس کے علاوہ کچھ اور پڑھا ہی نہیں، اور اس لئے نہیں پڑھا کہ پڑھانے والا خود ہی بدعت شرک علامہ ابن قیم، علامہ ابن تیمیہ، کے علاوہ کچھ جانتا ہی نہیں۔ ان کی پڑھائی شروع ہوتی ہے ابن قیم سے اور ختم ہوتی ہے ابن تیمیہ پہ۔ پھر قبر پر جانا شرک ،توسل شرک، چادر چڑھانا شرک۔ اس کے علاوہ انہیں کچھ اور علم آئے کہاں سے۔ ارے بھائی اگر کچھ پڑھے لکھے ہو تو اس کے آگے بڑھ کر بھی کوئی علمی سوال کر و تا کہ معلوم ہو کہ پڑھے لکھے بھی مدرسہ میں۔ رہ گئی بات مراسم خانقاہ و معمولات اہل سنت کی تو اس موضوع پر درسگاہ سے لے کر خانقاہ تک کے علما و مشائخ نے اتنی کتابیں لکھ دی ہیں تمہاری پوری جماعت اس کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہے۔ تم تو حافظ ہو، ان کتابوں کو پڑھ بھی نہیں پاؤ گے۔ اپنے بڑوں سے کہو کہ جس اعلیٰ حضرت پہ تم نے مضمون نگار بننے کے شوق اور جگہ جگہ ان کے عرس منائے جانے پہ جل بھن کر یہ مغلظات لے کر پندار اخبار میں آئے ہو ان کی کتابیں بھی پڑھنے کی صلاحیت ہے؟ یہ چیلنج قبول ہے تو آؤ، کوئی تاریخ طے کرو، میں ان کے فتاویٰ کا مجموعہ "فتاویٰ رضویہ" ہی سامنے رکھتا ہوں۔ ذرا سے پڑھ کے دکھا دو، پھر تم اس لائق ہو گے کہ تم سے کوئی علمی بحث کی جائے۔

اگر اردو کے فیروز اللغات دیکھ کر لفظوں کا معنی سمجھنا چاہو گے تو کیا سمجھو گے پیارے؟ اعلیٰ کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے تو ذرا یہ بتاؤ کہ مولا کا معنی اور لفظ کس کے لئے ہے؟ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کے لئے انت مولانا آیا ہے، پھر تمہارے مولوی "مولانا" کیسے ہو گئے؟ مولانا کا معنیٰ تو ہوا ہمارے مولا۔ تمہارے بقول اللہ مولا، اور تمہارے مولوی بھی مولا؟ کبھی اس پر بھی تمہیں توبہ کی توفیق ہوئی؟

خطابات والقابات کے اپنے مخصوص معانی ہوتے ہیں، اور اس کا تعلق اس عہد سے ہوتا ہے، اس عہد کی شخصیات کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ امام احمد رضا کے لئے اعلیٰ حضرت سے تمہیں کھجلی ہونے لگی۔ پڑھے لکھے ہوتے تو جانتے کہ ہر فرقہ والے نے اپنے اپنے پیشوا کو بڑے بڑے القابات دئے ہیں۔ ان میں ایک لقب "اعلیٰ حضرت" بھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب یہ لقب امام احمد رضا قدس سرہ کے لئے ایسا مقبول ہو گیا ہے کہ "اعلیٰ حضرت" کہنے سے ذہن فوراً امام احمد رضا کی طرف جاتا ہے۔ اگر اعلیٰ حضرت کے لقب کے حوالہ سے مطالعہ میں وسعت چاہئے تو بتانا تمہاری تشفی کے لئے حوالہ کے ساتھ بتادوں گا کہ ہندوستان میں کتنوں کے لئے "اعلیٰ حضرت" لکھا گیا ہے اور کون اس کے مستحق ہیں اور کون نہیں ہیں۔

رہ گئی بات عرس کی ،تو بابو! عرس اللہ والوں کا ہوتا ہے اور کونوا مع الصادقین کی تلاوت کرنے والے، اللہ والوں سے محبت بھی کرتے ہیں اور ان کا عرس بھی مناتے ہیں۔ اہل سنت و جماعت ہی میں اللہ والے ہوئے ہیں یہ جتنے مزارات ہیں ،خانقاہیں، درگاہیں ہیں یہ سب اہل سنت و جماعت والے ہیں کوئی ۱۸۵۷ کے بعد پیدا ہونے والے فرقہ دیوبندی وہابی ،قادیانی، عقیدہ کے نہیں ہیں۔ اگر یہ سنی نہیں ہوتے تو بزرگ ہی نہیں ہوتے۔ بزرگ ہیں تو سنی ہیں۔ اور سنی ہیں تو بزرگ ہوں گے۔ اور بزرگ ہوں گے تو عرس منایا جائے گا۔ کہ عرس کی اپنی معنویت ہے جسے اہل دل اور اہل علم سمجھتے ہیں۔ اب آپ فیصلہ کر لو کہ جس کے یہاں کوئی بزرگ ہی نہیں ہو وہ عرس کیا منائے

گا؟ اب آپ اپنی اس محرومی پہ جتنا من چاہے سر پیٹ لو مجھے کیا پڑی ہے کہ منع کروں۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کی شخصیت علم وفن اور ادب ومعرفت کے اعتبار سے بہت اونچی ہے۔ علمائے عرب وعجم نے ان کی عظمت کے قصیدے پڑھے ہیں، بڑے بڑے القابات سے یاد کیا ہے۔ ان سے اجازت وخلافت لی ہے اور بعضوں نے انہیں اجازت وخلافت دی ہے۔ بعضوں نے ان کی کتابیں تقاریظ لکھی ہیں اور کسی نے اپنی کتاب پر حاشیہ لکھوایا ہے۔ تفصیلات دیکھنی ہوتوں تو الدولۃ المکیہ، حسام الحرمین، فتاوی الحرمین، کفل الفقیہ الفاہم وغیرہ کتابوں کا مطالعہ کرلو عربی نہ آتی ہوتو ان کتابوں کی روشنی میں لکھے جانے والے مقالہ ''امام احمد رضا اور علمائے عرب'' پڑھ لو جو پروفیسر مسعود احمد مظہری کی ہے۔ حقیقت کھل جائے گی۔

آخر میں اتنا لکھ کر اپنی بات ختم کر رہا ہوں کہ شرک وبدعت کے ٹھیکیداری ہی اگر آپ نے لی ہے تو سعودی عرب میں سنیما گھر کھولنے کے خلاف بھی لکھو، سعودی حکومت کی قمار بازی کی اجازت پر بھی لکھو۔ سعودی شہزادہ کی اسرائیل دوستی کے خلاف بھی لکھو، عورتوں کو کھلی چھوٹ دینے کے خلاف بھی لکھو۔ مگر۔ نہیں لکھو گے کیوں کہ آقا شرک وکفر اور حرام کاری کے دلدل میں بھی ڈوبا ہو تو، آقا آقا ہے نا، ناراض ہوجائے گا، پھر آمدنی بند ہوگی، گمراہیت پھیلانے کا کارخانہ بند ہوجائے گا اور جتنی آسائشیں میسر ہیں سب بند ہوجائیں گی۔ اگر یہ جھوٹ ہے تو بتاؤ اس کے خلاف اتنا ایکشن لیا ہے، آپ لوگوں نے۔ اب بھی توبہ کا دروازہ کھلا ہے، دورنگی چھوڑ کر یک رنگی ہوجاؤ۔ اللہ اور اس کے رسول کے فرمان کو اہمیت دو۔ یہ ابن قیم اور ابن تیمیہ تمہیں ادھورا آئینہ دکھاتے ہیں اعلیٰ حضرت کو پڑھو اس آئینہ سے اسلام صاف نظر آئے گا۔

سب ان سے جلنے والوں کے گل ہوگئے چراغ
احمد رضا کی شمع فروزاں ہے آج بھی

* ۔خوشخبری خوشخبری خوشخبری * ۔

مدارسِ اسلامیہ کے لیے خوشخبری

القلم فاؤنڈیشن پٹنہ بہار دے رہا ہے۔

مندرجہ ذیل کتابیں خصوصی رعایت پر

(1) فارسی کی پہلی جدید ترتیب مع اضافہ تمرین
اصل قیمت 80 / رعایت (55)

(2) منہاج العربیہ اول جدید ترتیب
اصل قیمت 60 / رعایت (50)

(3) منہاج العربیہ دوم جدید
اصل قیمت 80 / رعایت (60)

(4) تسہیل المصادر جدید
اصل قیمت 80 / رعایت (60)

(5) میزان الصرف جدید بڑی سائز
اصل قیمت 100 / رعایت (55)

(6) گلزار دبستاں مع اضافہ تمرین
اصل قیمت 90 / رعایت (50)

(7) چہل حدیث جدید مع انگریزی
اصل قیمت 50 / رعایت (60)

(8) سچی نماز جدید ترتیب
اصل قیمت 80 / رعایت (60)

(9) دستور ہند کی تدریس
اصل قیمت 150 / رعایت (60)

(10) نوائے عارفاں
اصل قیمت 100 / رعایت (50)

یادِ رفتگاں

خلیفۂ ملک العلماء

حضرت مولانا فیض الرحمن اشرفی بلہوی کی خدمت حدیث

■ (ڈاکٹر) محمد حبیب الرحمن:
پرنسپل علامہ اقبال کالج، بہار شریف (نالندہ

بہار میں گوشۂ گمنامی میں بیٹھ کر خالصتاً لوجہ اللہ علوم دینیہ کی خدمت کرنے والوں کی فہرست تیار کی جائے تو اس میں والد بزرگوار حضرت مولانا فیض الرحمن اشرفی بلہوی قدس سرہٗ کا نام نمایاں طور پر نظر آئے گا جنہوں نے پوری زندگی علوم دینیہ خصوصاً تفسیر و حدیث کی تعلیم و تدریس میں ''نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ'' کو مطمح نظر بنا کر لگا دیا اور چہل حدیث کے پانچ مجموعے انتفاعِ عام کی خاطر منظر عام پر لا کر آخرت کے لئے توشہ جمع کر گئے۔ ان کے احوال و کوائف قلمبند کرنے کے حوالے سے بہت دنوں تک اس خوف کے زیر اثر رہا کہ قاری اس کو باپ کی قصیدہ خوانی پر محمول کر کے مضحکہ اُڑائیں گے مگر پھر اس خیال نے تقویت بخشی کہ نامور ہستیوں اور بزرگوں کے جتنے بھی احوال قلمبند کئے گئے ان سب میں آنے والی نسلوں کے لئے عبرت، ہدایت اور سبق کے انمول موتی بکھرے پڑے ہیں۔ اگر ان کے احوال ہم تک نہ پہونچتے تو ہماری تربیت کا ایک پہلو تشنہ رہتا۔ والد بزرگوار کے شب و روز کے معمولات، نشست و برخاست، اخلاق و اطوار اور کردار و گفتار کے مشاہدہ سے یہ واضح ہوا کہ ان کے گوشوارۂ زندگی سے بے شمار ایسے پہلوؤں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے، جن کی حکایت موجودہ نسلوں تک پہنچانا ضروری ہے کہ ان میں دینی و دنیوی ہر دو حیثیت سے ایسے نکات موجود ہیں جنھیں سفر حیات میں جادہ پیمائی کے لئے نشان منزل کے طور پر سامنے رکھا جاسکتا ہے۔

والد محترم حضرت مولانا محمد فیض الرحمن اشرفی نور اللہ مرقدہ دادیہال اور نانیہال دونوں اعتبار سے نہایت ممتاز علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ۱۱/رجب المرجب ۱۳۵۳ھ بروز یک شنبہ مدھوبنی ضلع کے بسفی تھانہ کے تحت بلہا گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا شرف الدین نور اللہ مرقدہ اپنی علمی قدآوری کے سبب اطراف و اکناف میں مشہور تھے۔ ان کے علم و ادب سے فیض پانے والوں کی تعداد بے شمار ہے۔ سیتامڑھی ضلع کے کما گاؤں میں ان کا قائم کردہ مدرسہ آج بھی تشنہ لبان علوم دینیہ کو سیراب کر رہا ہے۔ ابتدائی قواعد پر ان کی تالیف شرف القواعد بہت عرصہ تک مدارس کے نصاب میں شامل رہی۔ اسی طرح مولانا ممدوح کے دادا شیخ کفایت حسین کا شمار علاقہ کے مشہور فارسی دانوں میں ہوتا تھا۔

والد بزرگوار مولانا فیض الرحمن کی ابتدائی تعلیم اسی علمی گہوارہ میں ہوئی۔ قاعدہ بغدادی سے پارہ عم کی کچھ سورتوں تک اپنی بڑی اماں جواُن کی خالہ جان بھی تھیں، کے زیر تربیت ہوئی۔ والد صاحب کے زیر سایہ رہ کر ۱۴ سال تک ان کے چشمۂ علم و عرفان سے سیراب ہوتے رہے، جہاں شرح وقایہ، شرح جامی، قطبی وغیرہ پڑھ کر ۱۹۵۴ عیسوی میں جامع صحیح البہاری ملک العلماء حضرت مولانا ظفر الدین بہاری علیہ الرحمہ والرضوان کے

مدرسہ لطیفیہ بحرالعلوم کٹیہار بھیج دیئے گئے۔ یہاں دوسال تک حضرت ملک العلما کی تعلیم وتربیت سے فیض حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۵۶ عیسوی میں جامعہ نعیمیہ مرادآباد اور مظہر اسلام بریلی شریف میں مفتی حبیب اللہ قدس سرہ وغیرہ کے خرمن علم سے خوشہ چینی کرتے رہے۔ ۱۹۵۷ عیسوی میں پھر بحرالعلوم کٹیہار حضرت ملک العلماء کے زیر سایہ آگئے اور ۲/ مارچ ۱۹۵۸ عیسوی کی مبارک رات میں حضرت ملک العلما اور دیگر اساتذہ کرام اور علما عظام کے مقدس ہاتھوں سے دستارِ فضیلت سے مشرف ہوئے۔ حضرت ملک العلماء کے اجل شاگردوں میں حضرت مولانا محمد فیض الرحمن اشرفی کئی حیثیت سے شرف خصوصیت حاصل ہے۔ وہ حضرت کے معتمدین میں رہے اور بعض امور کی انجام دہی کے لیے انہیں مناسب وموزوں تصور فرماتے تھے۔ اپنے فرزند پروفیسر مختار الدین احمد کے انگلینڈ میں دوران تعلیم ان کے لیے خطوط ودیگر لوازمات کی ترسیل کی خدمت انہیں سے لیتے تھے۔ یہ استاد مکرم کے فیضان خصوصی کا ہی ثمرہ ہے کہ مدرسہ اشرفیہ اظہار العلوم، ماچھی پور میں کم وبیش ۵۳ سال تدریسی خدمات پر مامور رہے اور اس دوران جو نیک نامی اور عزت واحترام انہیں نصیب ہوا، وہ مدرسہ کے کسی اور اساتذہ کے حصے میں نہ آیا۔ دستار کے اگلے ہی دن اپنے استاد گرامی امام معقولات ومنقولات حضرت مولانا سلیمان اشرفی بھاگلپوری علیہ الرحمہ کے حکم پر انھیں کے گاؤں واقع مدرسہ اشرفیہ اظہار العلوم ماچھی پور، بھاگلپور میں نائب صدر مدرس کی حیثیت سے تدریسی خدمات پر مامور ہوگئے۔ یہاں کم وبیش ۵۳ سالوں تک مسلسل تین نسلوں کی علمی وفکری آبیاری کی۔ ان کے بہت سے شاگرد کئی اعلیٰ تعلیمی اداروں میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے علوم دینیہ کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اسی طرح ان کی تربیت یافتہ بہت سے شاگرد دنیوی مناصب کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔

بچپن سے درجہ عالم تک میں بھی اسی مدرسہ میں والد گرامی کے زیر سایہ رہ کر علوم دینیہ سے سرفراز ہوا۔ اعلیٰ درجوں میں تفسیر وحدیث کی تمام کتابیں انھیں سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ درجہ عالم میں تفسیر جلالین اور ترمذی شریف کا مکمل نصاب والد گرامی سے پڑھ کر فیضیاب ہوا۔ مدرسہ میں دوران قیام کے پورے عرصہ تک تفسیر وحدیث کی تعلیم سے طلبا کو مستفیض کرتے رہے۔ سبکدوشی کے بعد گجرات کے ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے میں انتظامیہ کی درخواست پر کچھ عرصہ تک مسند شیوخت پر جلوہ افروز رہے اور متداول کتب احادیث بشمول ترمذی، بخاری اور مسلم شریف کا درس دیتے رہے۔ بعدۂ دارالعلوم اہلسنت، جبل پور کے ارباب حل وعقد کے مسلسل اصرار پر وہاں کے مسند شیوخت کو سرفراز کیا۔ یہاں طلبہ کے علاوہ خود اساتذہ بھی آپ کے درس حدیث میں شامل ہوتے اور کنہیات احادیث کی فہم حاصل کرکے نازاں وفرحاں ہوتے۔ اس سے قبل جامع اشرف کچھوچھہ شریف جب اساتذہ کے حوالے سے بحرانی کیفیت سے دوچار ہوا تو اس کے سرپرست گرامی علیہ الرحمہ کے حکم پر وہاں بھی شیخ الحدیث کی حیثیت سے دوسال سے زیادہ اعلیٰ درجات کی کتابیں زیر تدریس رہیں۔ اس طرح جامع اشرف کی بحرانی کیفیت دور ہوئی اور اس کی علمی ساکھ برقرار رہی۔

تدریسی منہج:

والد محترم کے پڑھانے کا انداز بڑا نرالا تھا۔ اس لئے جس کو ان کی تدریسی توجہ نصیب ہوئی، اُن میں سے اکثر باصلاحیت عالم دین ہوئے۔ دوران تدریس نہ وہ عبارت خود پڑھتے اور نہ ہی اس کا ترجمہ کرتے، بلکہ یہ کام طلبہ سے لیتے پھر اس کا مطلب پوچھتے۔ وضاحت طلب امور پر ایسی تقریر فرماتے کہ امر مسئول کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہتا۔ دوران تشریح علمائے سلف کے اقوال اس طرح بیان فرماتے کہ جیسے تمام مراجع سامنے کھلے پڑے ہوں۔ تطبیق احادیث کے حوالے سے جتنے اقوال ہوتے سب پر روشنی ڈالتے۔ عبارت خوانی کا کام کسی ایک طلبہ سے نہیں لیتے بلکہ یہ

کام درجہ کے ہر طالب علم کے حصہ میں آتا، اسی لئے ہر طالب علم مطالعہ کرکے اور پوری طرح تیار ہوکر آتا۔

سنت سے محبت اور اس کے احیاء کی کوشش:

کوئی شخص ہر سنت پر عامل ہو، یہ محال ضرور ہے لیکن اگر کسی کا ہر عمل سنت کی پاسداری میں ہو، تو یہ بلاشبہ شخصیت کا کمال ہے۔ ایسے ہی لوگ رضائے مصطفٰے اور عطائے رب مصطفٰے ﷺ کے حقدار ہوتے ہیں۔ کتابوں میں اللہ کے ولی کی علامت کے حوالے سے پڑھا تھا کہ جو جس قدر سنت نبوی سے قریب ہوگا، یا جو جس درجہ عامل علی السنۃ ہوگا، اسی نسبت سے اس کے اندر ولایت کی شان ظاہر ہوگی۔ اللہ کا ولی ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ کرامات دکھاتا پھرے، بلکہ اس کے کردار وگفتار سے متاثر ہوکر خود بخود خلق خدا اس کی طرف راغب ومائل ہو۔ ان اصول وعلامات کی روشنی میں ابا کو ولی اللہ مانتا ہوں، اس کے لیے مجھے کسی دوسری سند کی حاجت نہیں؛ کیوں کہ میں نے ان کا کوئی بھی عمل سنت کے خلاف نہیں پایا۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ان کے عمل کو عرف عام سے ہٹ کر پایا ہے، اس کی وجہ پوچھا تو بتایا کہ یہی سنت ہے اور پھر اس کی تائید میں کوئی حدیث شریف ضرور سناتے مثلاً ناخن تراش کر یونہی پھینکتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا، بلکہ تھوڑی مٹی کرید کر اس میں دبا دیتے۔ وجہ پوچھنے پر بتایا کہ یہی سنت ہے۔ خدا بخش لائبریری میں کام کے دوران علامہ سیوطی کے **رسالہ الاسفار بقلم الاظفار** کو دیکھا، اس میں یہ جزئیہ موجود ہے۔ اسی طرح سنت کو زندہ کرنے کی فکر بھی فرماتے۔ بچپن میں اکثر گھریلو تنازعہ ہوجاتا، جس کے نتیجے میں آپس میں میل ملاپ اور لین دین بھی متاثر ہوتا۔ ابا ہمیشہ اس کو دور کرنے کی پہل کرتے۔ ہم لوگ اس پر احتجاج کرتے، تو فرماتے:

''ہم صلہ رحمی کے تقاضے کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر حدیث پاک **صل من قطعك** (تم اس کے ساتھ صلہ رحمی کرو، جو تم سے قطع رحمی کرے) سناتے اور فرماتے کہ میری کوشش اگر بار آور ہوئی تو نور علی نور اور اگر ایسا نہیں ہوا تو کم سے کم سنت پر عمل کرنے کا ثواب تو حاصل ہوگا۔ احیائے سنت کے حوالے سے ابا کا ایک عمل دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ والدہ مرحومہ (اللہ ان کی قبر کو نکہت ونور سے معمور کرے) کے جنازے کو قبرستان سے پہلے درمیان میں ہی ایک جگہ رکھنے کو کہا، جنازہ رکھا گیا، پھر اٹھایا گیا۔ میرے استفساری نظر کو سمجھ گئے اور صرف اتنا فرمایا کہ یہ سنت ہے۔ احیائے سنت کے حوالے سے ابا کا یہ عمل مجھے حیران کرتا رہا۔ گھر واپسی پر میں نے تفصیل جاننا چاہی، تو فرمایا کہ جنازے کو درمیان رکھنا سنت ہے اور اس عمل کے لیے حدیث پاک میں ''منزل'' کا لفظ آیا ہے۔ اس لفظ منزل نے میری برسوں کی کرید کا جواب دے دیا۔ گاؤں میں اکثر لوگوں سے سنتے تھے مٹی مجل ہوگئی، یا کب ہوگی وغیرہ مٹی کا مطلب تو واضح تھا، مگر مجل ہمیشہ سمجھ سے پرے رہا اور اسے گاؤں والوں کا عرف عام سمجھتا رہا لیکن ابا کی وضاحت سے یکسر ذہن روشن ہوگیا کہ لوگوں کا عرف عام مجل دراصل منزل ہے۔ جنازے کے حوالے سے یہ عمل میں نے کبھی بھی کہیں بھی نہیں دیکھا۔ سوچنے لگا کہ علمائے کرام کی نظر سے آخر اس قسم کی احادیث کیوں اوجھل ہیں۔ اگر اوجھل نہیں، تو اس کے احیاء کی کوشش کیوں نہیں کرتے کہ **من سن سُنۃ فلہ اجرھا** (جس نے کسی سنت کو زندہ کیا، تو اس کا اجر اسے ملے گا) کے حق دار بنتے''۔

اسی طرح ایک واقعہ اور قابل ذکر ہے۔ ایک دن میرا بڑا لڑکا اپنے کسی ساتھی سے فون پر بات کر رہا تھا، جسے ابا بھی سن رہے تھے۔ آخر میں اس نے اللہ حافظ کہہ کر فون منقطع کر دیا۔ تو فوراً ابا نے اسے ٹوکا اور فرمایا کہ کسی سے رخصت ہوتے وقت، یا بات ختم ہونے پر خدا حافظ یا اللہ حافظ کہنے کے بجائے سلام کیا کرو کہ یہی سنت ہے۔ فرمایا کہ رسول پاک ﷺ کے پاس جب کوئی آتا، یا خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ کی غرض سے کہیں تشریف لے جاتے، تو آخر میں سلام کر کے ہی رخصت کرتے، یا ہوتے۔ اس کو سلام وداعی کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد سے اس کی زبان پر بھی لفظ خدا حافظ یا اللہ حافظ نہیں آیا، بلکہ سلام کر کے ہی بات ختم کرتا ہے اور میں نے بھی اسی دن سے اپنا معمول یہی بنا لیا۔

تالیف اربعینیات:

دار العلوم اہل سنت، جبل پور کے دوران قیام اربعینیات کی تالیف خدمت حدیث کے حوالہ سے مولانا ممدوح علیہ الرحمہ کا بڑا کارنامہ ہے جو یقیناً اُن کے لئے توشۂ آخرت ثابت ہوں گے۔ چالیس احادیث جمع کر کے افادۂ عام کے لئے وقف کرنے کی فضیلت اور اس کی تمنا کا ذکر اکثر والد بزرگوار کیا کرتے تھے۔ اُن کے پیش نظر حضور سرور کائنات ﷺ کا وہ ارشاد مبارک تھا کہ " من حفظ علی امتی اربعین حدیثا فی امر دینها بعثه الله فقیها و کنت له یوم القیامة شافعا و شهیدا" (مشکوۃ شریف) یعنی جس نے میری امت تک ان کے دینی معاملات سے تعلق رکھنے والی چالیس حدیثیں پہنچا دی، اللہ تعالیٰ اسے فقیہ کا رتبہ دے کر اٹھائے گا۔ روز قیامت میں اس کی شفاعت کروں گا اور اس کا گواہ بنوں گا۔ اس حدیث پاک کی روشنی میں مؤلف اربعینیات شفاعت نبوی ﷺ کی دولت عظمیٰ کو اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے عمر بھر کی مخلصانہ خدمت حدیث اور ارادہ کی نیکی کی لاج رکھ لی اور چالیس حدیثوں کو عامۃ المسلمین تک پہنچانے کی فضیلت سے سرفراز فرمایا اور جبل پور کے قیام کے دوران یکے بعد دیگرے پانچ چہل احادیث کے مجموعے منظر عام پر لا کر افادۂ عام کے لئے وقف کرنے کا شرف حاصل کیا۔ چالیس احادیث کا پہلا مجموعہ ان کے نام کی نسبت سے:

۱۔ ''فیض الاربعین (مع جواہر پارے)'' کے نام سے شائع ہوا۔ فیض الاربعین (مع جواہر پارے) ۲۰۱۳ عیسوی میں دار العلوم کے جشن دستار فضیلت کے موقع پر مولانا سیف خالد اشرفی بھاگلپوری کے زیر اہتمام منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ باقی تمام چار اربعین بھی ہر سال اسی موقع پر اشاعت پذیر ہوئے۔ طلبہ نے دستار فضیلت کے لئے روایتی دعوت نامہ کے بجائے انھیں اربعینیات کو دعوتی کارڈ کی حیثیت سے اپنے خیر خواہوں میں تقسیم کیا۔ دعوت نامہ کے اس انوکھے انداز نے تالیف اربعینیات کے مقصد کو محقق کر دیا۔ اس اربعین کے پیش لفظ میں مولانا سیف خالد اشرفی نے لکھا ہے کہ ''اس کتاب اربعین کی خاص بات یہ ہے کہ احادیث کریمہ کا ترجمہ سلیس، عام فہم اور ژولیدگی سے پاک ہے۔ نیز ہر حدیث سے پہلے ایسے عنوان قائم کئے گئے ہیں جو حدیث کے معنی و مراد کو مفہوم سے قریب تر کر رہے ہیں''۔ پہلے حدیث کا متن حوالے کے ساتھ نقل کیا ہے پھر ترجمہ اور جا بجا ضروری تشریح بھی کرتے چلے ہیں، جس کی وجہ سے استفادہ و انتفاع کی صورت بہت آسان ہو گئی ہے۔ تمام اربعینیات میں احادیث کی پیش کش اسی منہج پر ہے۔ چالیس احادیث کے بعد ''جواہر پارے تجربات کی روشنی میں'' کے عنوان سے ۲۲ (بائیس) جواہر پارے پیش کئے گئے جو معلم و متعلّم کی تربیت، علم کی حفاظت، عالم کی ذمہ داری اور علم کے مقصد کے حوالہ سے واقعی انمول موتی ہیں، جن پر عمل کر کے عملی زندگی کو باعث خیر و برکت بنایا جا سکتا ہے۔

۲۔ دوسرا مجموعہ احادیث کو اپنے پیرو مرشد سرکار کلاں سید مختار اشرف اشرفی الجیلانی کچھوچھوی علیہ الرحمہ والرضوان سے معنون کرتے ہوئے "مختار الاربعین (مع جواہر پارے)" کے نام سے ترتیب دیا۔ یہ مجموعہ احادیث ۲۰۱۴ عیسوی میں جشن دستارفضلیت کے موقع پر اشاعت پذیر ہوا۔ اس میں بھی احادیث کے اختتام پر سات جواہر پارے ہیں جو تعلیم وتربیت کے حوالے سے بہت قیمتی ہیں۔

۳۔ تیسرا مجموعہ احادیث (اربعین) حضرت الشاہ سید تنویر اشرف اشرفی الجیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی فرمائش پر ترتیب دیا جو حضرات اہل بیت کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے فضائل پر صحیح احادیث پر مشتمل ہے۔ اسی مناسبت اس اربعین کا نام "تنویر الاربعین فی فضائل اهل البیت الاکرمین" رکھا۔ فضائل اہل بیت رضی اللہ عنہم پر چالیس احادیث کا یکجا جمع ہونا اہل علم کے لئے بڑا تحفہ ہے۔

۴۔ اربعین کا چوتھا مجموعہ "ظفر الاربعین" کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اس مجموعہ احادیث کو اپنے استاد گرامی ملک العلماء حضرت مولانا ظفر الدین بہاری جامع صحیح البہاری سے منسوب کیا، جو ۲۰۱۶ عیسوی میں دارالعلوم کے جشن دستارفضلیت کے موقع پر سابقہ روایات کے مطابق منظر عام پر آیا۔

۵۔ پانچواں مجموعہ احادیث (اربعین) اپنے والد بزرگوار حضرت مولانا شرف الدین نور اللہ مرقدہ کی نسبت سے "شرف الاربعین" کے عنوان سے ترتیب دیا۔ یہ مجموعہ بھی ۲۰۱۷ عیسوی میں مذکور الصدر موقع پر ہی اشاعت پذیر ہوا۔

ان تمام اربعینیات میں ایسی احادیث مبارکہ جمع کی گئیں ہیں جو عام طور سے مطالعہ میں نہیں آپاتی ہیں لیکن جو دنیوی مصالح وضروریات اور اخروی صلاح وفلاح کے لئے کلیدی باتوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ خدمت حدیث کے حوالہ سے مؤلف اربعینیات حضرت مولانا فیض الرحمان اشرفی بلہوی کی مخلصانہ کاوشوں کو اللہ تعالیٰ شرف قبولیت سے سرفراز فرمائے اور آخرت میں ان کے لئے ذخیرہ بنادے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

درازیٔ عمر کے زیر تقاضہ جب گھر کو لازم پکڑا تو یہاں بھی خدمت حدیث کا سلسلہ جاری رہا۔ اطراف واکناف سے علما تشریف لاتے اور والد گرامی سے ختم بخاری شریف کا درس لیکر سند حدیث سے سرفراز ہوتے۔ حضرت ممدوح نور اللہ مرقدہ محض سند حدیث نہیں دیتے بلکہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کا مکمل درس دیتے۔ آپ کی تقریر سے علما اس قدر متاثر ہوتے کہ بعد فراغت گھنٹوں استفادہ کے لئے قیام پذیر رہتے۔ اس طرح میرا گھر بھی قال اللہ وقال الرسول کی سرمدی گونج سے معمور رہا جس کے فیوض وبرکات کی رونق میں آج بھی واضح طور پر محسوس کرتا ہوں۔

*****

"الرضا" رسالہ نہیں تحریک ہے!

اس کا ممبر بنیں، تعاون کریں!

لوگوں کو اس کی طرف مائل کریں!

اور مسلک اعلیٰ حضرت کی اشاعت میں

ہمارا ہاتھ بٹائیں!

رابطہ نمبر

۸۵۲۱۸۸۹۳۲۳ / ۹۸۳۵۴۲۳۴۳۴

شمالی بہار میں دار العلوم مفسر اعظم کا قیام اور اس کا افتتاح

یہ تعلیمی ادارہ پوپری بلاک کے علاقہ میں علم وفن کی نئی تاریخ رقم کرے گا: ڈاکٹر نجم القادری

دار العلوم مفسر اعظم کی تعمیر وترقی میں حصہ لینا دین کی خدمت اور وقت کی اہم ضرورت ہے: مفتی ثناء اللہ خاں رضوی

علم انسان کی دنیاوی ضرورت ہی نہیں دل کا سکون اور آخرت کا سرمایہ بھی ہے اگر اسے رضائے حق اور خدمت دین کی خاطر حاصل کیا جائے۔ انسانوں کے درمیان فضیلت کا مدار علم پر ہے اور مذہب اسلام نے بار بار حصول کی تاکید فرما کر دراصل اسی فضیلت کے حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے۔ چنانچہ اسی غرض سے مرکزی دار القضا ادارہ شرعیہ کے قاضی شریعت حضرت مفتی ڈاکٹر امجد رضا امجدؔ نے پوپری اسٹیشن کے قریب مرکزی مدینہ مسجد کے پہلو میں ''دار العلوم مفسر اعظم'' کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم فرمایا جس کا افتتاح ۲۶؍اپریل ۲۰۲۶ کو جشن عرس تاج الشریعہ کے موقع سے ہوا۔ اس جشن میں علم وفضل کی عظیم شخصیات اور سماجی خدمات میں ممتاز مقام رکھنے والے افراد نے شرکت فرمائی اور اپنے خطبہ میں اس ادارہ کے قیام کو مستحسن اور تاریخی کام بتایا۔ اس موقع پر علمائے کرام مفتیان عظام اور شعرائے ذوی الاحترام نے نثر ونظم میں گلہائے عقیدت پیش کیے۔ ان شرکا میں استاذ العلما حضرت مولانا ڈاکٹر غلام مصطفےٰ نجم القادری، پیر طریقت حضرت مفتی ثناء اللہ خاں رضوی صاحب، حضرت مولانا محمد قمر الزماں مصباحی مظفر پور، حضرت مولانا نور الہدیٰ خاں فیضی مصباحی قاضی ادارہ شرعیہ سیتامڑھی، حضرت مولانا محمد رضا صاحب قاضی ادارہ شرعیہ موتیہاری، مفتی فیضان الرحمٰن سبحانی قاضی ادارہ شرعیہ دربھنگہ کمشنری مولانا عامر رضا، مولا معراج رضوی دار العلوفیض الرضادوری، مولانا فیضان رضا دار العلوم واجدیہ دربھنگہ، مولانا خالد رضا ابن مفتی اعظم ہالینڈ دربھنگہ، حافظ قمر عالم صاحب بچھاڑ پور، قاری محمد توصیف رضا یوسفی، قاری نیاز صاحب پوپری، عزیزی سیف رضا مدینہ مسجد پوپری، حافظ شمس تبریز گھگراہا، مولانا جمشید صاحب ہرپوروا، حافظ توقیر امام صاحب سروارا، جناب صدر البدر خان، جناب ظفر اللہ خان صاحب، جناب شرف عالم خان صاحب، جناب سیف العمر خان صاحب، جناب چاند خان صاحبان (گنگٹی) یوسف بھائی سروارا، جناب اشتیاق خان صاحب، جناب اشرف عرف گولڈن، جناب واسع خان صاحب، جناب کامران خان صاحب، شیرو بھائی، عبد الستار پوپری، عبد الواجد روکی، جناب محب اللہ خان صاحب (مڑپا سیتامڑھی)، پرویز پوپری، توصیف رضا جامعی، شوکت پوپری، حافظ الطاف صاحبان (پوپری) ان کے علاوہ دیگر محترم شخصیات بھی اس موقع پر جشن میں حاضر ہوئے۔

پروگرام کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا، پھر شعرائے کرام نے نعت پاک کے ہدیے پیش کیے اور حضرت مولانا ڈاکٹر نجم القادری صاحب حضرت مولانا قمر الزماں قمر مصباحی، حضرت مولانا نور الہدیٰ خاں مصباحی اور حضرت مولانا محمد رضا رضوی نے اپنے اپنے خطبے اور تاثرات پیش کیے۔ جس میں دار العلوم مفسر اعظم کے قیام کو مستحسن قدم بتاتے ہوئے ڈاکٹر امجد رضا امجدؔ کے اس اقدام کو تاریخی قدم بتایا اور کہا کہ یہ دار العلوم علاقہ میں علم وفن کی نئی تاریخ رقم کرے گا۔ ان علمائے کرام نے اپنے خطبہ میں حضرت مولانا صلاح الدین رضوی، جناب اشتیاق خان اور جناب سیف رضا صاحبان کی دار العلوم سے وابستگی کو فال نیک بتاتے ہوئے ان کی خدمات کی تحسین کی۔ ایک بجکر ۳۵ منٹ پر قطب زمانہ حضور تاج الشریعہ علامہ شاہ مفتی اختر رضا خاں قادری ازہری نور اللہ مرقدہ کا قل شریف ہوا اور اختتام مجلس کے بعد لنگر تاج الشریعہ سے شرکا کی ضیافت کی گئی۔

المعلن: (مولانا) محمد صلاح الدین رضوی: مہتمم دار العلوم مفسر اعظم پوپری، سیتامڑھی بہار

AL-RAZA International (Bimonthly)

Printed by: Ahmad Publications Pvt. Ltd. Qadri Manzil
Opp. Patna Collegiate School, Baripath, Patna, Bihar (India) 800004

القلم فاؤنڈیشن، پٹنہ کی درسی مطبوعات

- نوائے عارفاں
- سچی نماز
- فارسی کی پہلی
- دستور ہند کی تدریس
- تسہیل المصادر
- منہاج العربیہ (اول۔دوم)
- گلزار دبستاں
- میزان ومنشعب
- چہل حدیث
- اسلام اور پردہ

القلم کی زیر طبع درسی کتابیں

- تاریخ اسلام کی تدریس
- گلستاں (پہلا اور آٹھواں باب: مع مشقی سوالات)
- فیض الادب (اول۔دوم)
- سیرت رسول کرم
- قصد الصیغہ

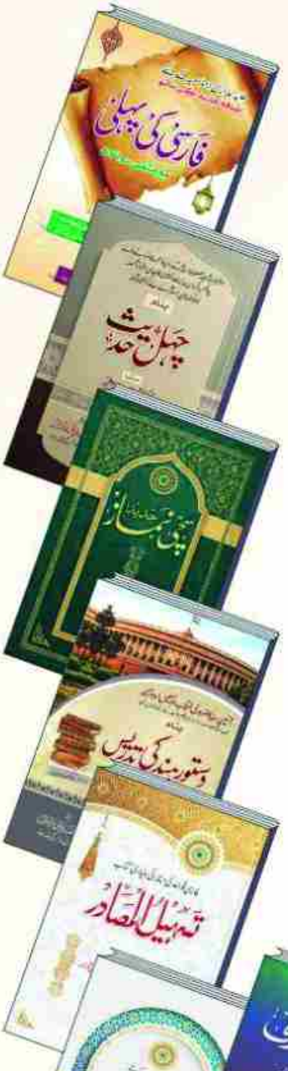

Printed at: Ahmad Publications Pvt. Ltd. Patna #8521889323